انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

قیمت
سالانہ تین روپئے
ایک پرچہ
دس نئے پیسے
تاریخ اشاعت
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

Regd. No. A. 922
Telephone No. 29
Telegrams "ANJUMAN"

ایڈیٹر — آل احمد سرور

جلد ۱۸	علی گڑھ — یکم جون سنہ ۱۹۵۹ء	شمارہ ۲۱

Anjuman Taraqqi-e-Urdu (Hind)

قدیم مثنوی نوسرہار

سخاوت مرزا

دکن میں ایک قدیم مقولہ مشہور ہے: اشرف بیابانی، بھوکے کو بھوجن پیاسے کو پانی۔ جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

اُردو ادب علی گڑھ ستمبر سنہ ۱۹۵۷ء میں مکرمی ڈاکٹر نذیر احمد کا ایک مقالہ بعنوان دکن کی ایک قدیم مثنوی "نوسرہار" مصنفہ اشرف پر شائع ہوا ہے۔ جس میں میرے نقطۂ نظر سے بعض فرو گذاشتیں ہیں، حتیٰ کہ نہ صرف موصوف بلکہ ڈاکٹر سید غلام محی الدین قادری زورؔ بھی مُصنّف کے حالات کی تحقیق میں قاصر رہے ہیں، یا شاید بعض اور تذکرے نظر سے اوجھل رہے۔ ڈاکٹر زورؔ کا بیان ہے کہ "اس شاعر نے صرف[۱] ایک جگہ ضمناً ایک بزرگ شیخ ضیاء غالباً ضیاء الدین کا ذکر آ گیا ہے"۔ اس سے ڈاکٹر زورؔ صاحب نے یہ قیاس تو کیا ہے کہ "وہ بزرگ یا ضیاء الدین بیابانی ہونگے جو سید علی سانگڑے سلطان مشکل آسان" "قندھاری المتوفی سنہ ۹۴۶ھ کے بھانجے اور خلیفہ اور مطلوب الطالبین کے مصنف تھے یا شیخ ضیاء الدین" "غزنوی جو شیخ سراج جنیدی کے خلیفہ اور شیخ عین الدین گنج العلم کے معتقد تھے جو بیجاپور میں سنہ ۸۰۰ھ میں فوت اور مدفون ہوئے" الخ

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب اُردو ادب ستمبر سنہ ۱۹۵۷ء کے صفحہ ۴۲ پر تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"شیخ مذکور کی شخصیت کے تعیّن کے لئے صوفیوں کے بہت تذکرے زیرِ مطالعہ آئے۔ مگر اس نام کے کسی ایسے صوفی بزرگ کا پتہ نہ چل سکا جو اشرف کے ہمعصر یا قریب العصر ہوتے۔ اخبار الاخیار، گلزار ابرار، خزینۃ الاصفیا، معارج الولایت، مراۃ الاسرار وغیرہ میں شیخ ضیاء کا عدم شمول اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ وہ مقامی اہمیت والے بزرگ تھے، تعجب ہے کہ تذکرۂ اولیاء دکن بھی شیخ ضیاء الدین کے ذکر سے خالی ہے۔۔ الخ

البتہ جن قرائن کی بنیاد پر اس کو احمد نگر کا باشندہ سمجھا گیا ہے وہ زیادہ قابلِ قبول نہیں الخ

میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحبان کی نظر سے ایک اور اہم تذکرہ الموسوم بہ پنج گنج[۱] مولفہ قاضی محمد فاضل درنگی المتوفی سنہ ۱۲۱۱ھ۔ تالیف ۱۱۹۵ھ نیز اورنگ آباد گزیٹیر[۲] (انگریزی) و رپورٹ آثار قدیمہ حیدرآباد سنہ ۱۹۳۱ء / ۱۹۳۲ مطبوعہ نہیں گزری ہیں جن میں اشرف بیابانی رح کا ذکر ہے۔ اس خاندان بیابانی کا ایک خاص تذکرہ الموسوم بہ ضیاء[۳] بیابانی سنہ ۱۳۶۳ھ میں طبع اور شائع ہو چکا ہے۔ غرض سب سے اہم چیز جس کی تلاش ہے وہ نوسرہار کے مصنف کی ہے۔ قاضی محمد فاضل نے تذکرہ پنج گنج میں جو طبع ہو چکا ہے لکھا ہے کہ نوسرہار اور قصّۂ آخرالزماں ہندی کے مصنف شاہ اشرف بیابانی ابن ضیاء الدین بیابانی ہیں۔ مؤلّف کے الفاظ یہ ہیں:-

"حضرت مخدوم در زبان ہندی نسخہ نوسرہار و قصہ آخرالزماں وغیرہ تصنیف نمود"۔ گنبد مبارک کے متعلق لکھتے ہیں:- روضۂ مبارک مکانے دل کشا و صفت گنبد شریفش بدیدن سرور دلہا بیفزاید"، وقطعہ جنّت معلوم می شود و کاریگری گنبد در دکھن لانظیر است الخ نیز یہ بھی لکھا ہے کہ اس گنبد کی تعریف میں کسی شاعر نے ہندی میں اشعار لکھے تھے، فرماتے ہیں "کسے تعریف آں بزبان ہندی گفتہ ؎

دیکھوں تا دریں گنبد کرے گفتار اسماں سوں ● کہ پانچوں کلس کے اوپر چندر... اسماں سوں

---

[۱] فہرست مخطوطات ادارۂ ادبیات اُردو مطبوعہ جلد ۱

[۱] تذکرہ پنج گنج مؤلفہ قاضی محمد فاضل مطبوعہ حیدرآباد

[۲] اورنگ آباد گزیٹیر انگریزی مطبوعہ (۔ صفحہ)

[۳] ضیاء بیابانی مولفہ شاہ محی الدین

دوسری اہم چیز کاتب "نوسرہار" کی سکونت احمدنگر بتلائی گئی ہے جو وہاں کا قاضی تھا۔ اس کے لئے خاندان اشرف بیابانی قدس سرہٗ کے آباو اجداد کی سکونت اور پھر تاریخ احمدنگر پہ روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ حضرت اشرف رح کی اور ان کے افراد خاندان کی سکونت تعلقات امبڑ۔ جالنہ تعلقات اورنگ آباد اور قندھار ضلع ناندیڑ (علاقہ نظام) رہی اور قندھار اُس زمانہ میں سلطنت احمدنگر میں شامل تھا (دیکھو تاریخ قندھار موٗلفہ امیر حمزہ مطبوعہ) سلطان حسن نظام شاہ احمدنگری نے قندھار کو ۹۵۵ھ میں فتح کیا جو اس وقت سلطنت برید یہ بیدر میں شامل تھا، ہم کو تو یہاں حضرت اشرف بیابانی رح کی سکونت سے بحث ہے جو قادر آباد جالنہ (اورنگ آباد) میں سکونت پذیر تھے۔ اور ایک مرتبہ بادشاہ احمدنگر اس نواح میں آیا تھا، اور حضرت موصوف نے اس کی مع لشکر کے ضیافت کی تھی ہموٗلف پنج گنج کا بیان ہے:۔ "می گویند کہ بادشاہ احمدنگر بعزم سفر ازاں طرف راہی شد و بملاقات مخدوم شاہ اشرف بیابانی قدس سرہٗ آمدہ، آنحضرت اور امعہ مجلس سپاہ و خدام کہ دراں سواری حاضر بودند، ہمہ کس را خورانیدند، با وصف فقر و فاقہ و مسکن در بیابان لیس اور ازبان زد خلق اللہ شدہ، شاہ اشرف بیابانی۔ بھوکے کو بھوجن پیاسے کو پانی۔ داو صاحب علم ظاہر و باطن بودہ ولبسا خرق و کرامات بظہور آمد الخ۔

اشرف بیابانی بلحاظ تصنیف نوسرہار (۹۰۹ھ) بہمنی دور سے متعلق ہیں چنانچہ آپکی ولادت و وفات ۸۶۴/۹۳۵ھ ہے۔ آپ شاہ ضیاء الدین بیابانی ۸۱۱/۹۰۹ھ کے صاحبزادے تھے۔ ان کے جدامجد سید عبدالکریم بیابانی ملک سندھ پاکستان سے آئے تھے، اور جنگلوں و بیابانوں میں سکونت کی وجہ سے بیابانی مشہور ہو گئے تھے۔ شاہ اشرف نے بعمر ۱۷ سال (۹۳۵ھ) میں وفات پائی۔ فقر آباد جالنہ میں گنبد عالی شان موجود ہے اس لحاظ سے شاہ صاحب رح سلطان نظام شاہ بہمنی ۸۶۴/۸۶۷ھ سلطان محمد شاہ ثانی بہمنی ۸۶۷/۸۸۷ھ اور سلطان محمود بہمنی ۸۸۷/۹۲۴ھ اور کلیم اللہ بہمنی ۹۳۳/۹۳۴ھ کے معاصر تھے۔

اس زمانہ کا دکھنی ادب:۔ معراج العاشقین خواجہ سید محمد گیسو دراز المعروف بہ بندہ نواز قدس سرہ المتوفی ۸۲۵ھ۔ نشاط العشق شاہ عبداللہ مرید خواجہ بندہ نواز رح۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، مصنفہ نظام بہمنی تصنیفات میراں جی شمس العشاق المتوفی ۹۰۲/۹۶۲ھ ہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے نوسرہار اشرف کی زبان، محاوروں پر کافی روشنی ڈالی ہے اور بہت سے محاورے، فقرے وغیرہ درج فرمائے ہیں جن میں حسب ذیل محاورے غور طلب ہیں:۔ وقت آنا۔ چلتا ہونا۔ (آوے وقت اور چلتا ہوئے) دوڑ ملانا۔ (ادھر اُدھر دوڑ ملاؤ) صبر پکڑنا۔ آس پکڑنا۔ ہاتھ ملنا۔ دھائیں دھائیں رونا۔ (دھائے دھائیں روئے عبداللہ) کیا موں لے کر جینا۔ بال بیکا کرنا (کرے جو اس کا بیکا بال) موک کالا ہونا۔ (منہ کالا ہونا) دانت انگلی پکڑنا۔ (صٓ ۵۹ تا صٓ ۶۸) کیا ایسے محاورے قدیم دکھنی تصانیف مثلاً بہمنی دور۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مصنفہ نظامی بہمنی۔ معراج العاشقین بندہ نواز رح۔ یا تصانیف میراں جی شمس العشاق میں ملتی ہیں۔ اگر یہ محاورے اُس وقت مروّج نہیں تھے تو پھر اس کا سن تصنیف ۹۰۹ھ مشتبہ ہو جاتا ہے اور محققین اس پہ روشنی ڈال سکتے ہیں بقول (صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے)۔

غالباً اس کے تتبع میں ایک بزرگ علی اکبر نے چھ سرہار لکھی ہے (مخطوطہ سالار جنگ)

راجستھان اور مخطوطات

ابو الفیض کاآل ایم اے

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ راجستھان کے گوشہ گوشہ میں بھی نادر مخطوطات بافراط اس لئے عدم توجّہی کی گرد میں اَٹے پڑے ہیں کہ وہاں چند ہستیوں کے علاوہ مثلاً مولانا شاغل و حکیم مفتی احمد حسن خاں صاحب وغیرہ۔ نہ اُن نوادر کا کوئی قدرداں ہے۔ نہ اُن کی قدر و قیمت سے اُن کے مالک واقف۔ یہ جواہر پارے نااہل لوگون کے قبضہ میں ہونے کے باعث بسرعت تمام تلف ہو رہے ہیں اور مالکان مخطوطات میں یہ صلاحیت و وقفیت بھی نہیں ہے کہ اُن سے مالی منفعت حاصل کرلیں، اور کتب وغیرہ کہیں محفوظ ہو جائیں۔

کیا اچّھا ہو کہ نیشنل میوزیم دہلی۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) اور اسلامک اسٹڈیز بورڈ علی گڑھ اس طرف خاص طور پر توجّہ کرے۔ مثال کے طور پر ہم ایک مختصر بیاض مملوکہ مولٰنا شاغل کا حوالہ دیتے ہیں جس پر علّامہ سعید نفیسی۔ استادِ ادبیاتِ ایران نے بزبان فارسی اپنے مضمون "تاریخ درست درگذشت سعدی" میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"سندِ بسیار معتبرے این نکتہ را کاملاً ثابت می کند و شک را ازمیاں برمی دارد، آقائے شاغل کہ از دانشمندانِ سال خوردہ و بسیار فروتن و خوشروئے ہندوستان ساکن شہر جے پور است، بیاضے کہن دارد کہ مخصوصاً برائے بہرہ جوئی من یا خود از جے پور بہ علی گڑھ آورد۔ واز ۱۳ فروردینِ امسال در علی گڑھ چندروز من گرم بہرہ یابی ازاں بودم۔ خط و کاغذ ایں بیاض قطعاً از آغاز قرنِ ہشتم ہجریست، و پیداست کہ مردے دانش مند آگاہ و جویندہ حق و حقیقت در تبریز آں را فراہم کرد و بسیار مطالب مہم ادبی و تاریخی بنظم و نثر فارسی دراں بخط خود نوشتہ"

اس کے بعد مطالب کی پوری تفصیل اور ان کی قدامت و اہمیت کی وضاحت کے بعد کہ جن کا سلسلہ ۸ھ ہجری تک پہنچتا ہے۔ آخر میں علّامہ نفیسی لکھتے ہیں کہ:۔

"دریں صورت من از آقائے شاغل مالک ایں بیاض بسیار سپاس گذارم کہ دانش دوستی، و کشادہ دستی او و مہربانی خاصی کہ در امانت دادن ایں سفینہ دربارہ من داشت مارا یاری کرد کہ ایں مشکل جانکاہ را کہ سالہا و شاید قرنہا، ناکشادہ ماندہ بود، بدیں گونہ بکشائیم"

(ملاحظہ ہو مجلہ "دانش کدۂ ادبیات" شمارہ ا سال ششم تہران مہرماہ ۱۳۳۷ صفحہ ۴۸ سطر ۱۴ تا آخر صفحہ ۸۶ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۵۸ء)

بلامبالغہ اس قسم کے کثیر مخطوطات راجستھان میں جابجا کس مپرسی کے عالم میں پڑے ہیں اور خوراکِ کرم و خار بن رہے ہیں ابھی وقت ہے کہ اہلِ علم ان سے باخبر و مستفید ہو سکیں ورنہ کچھ مدّت بعد یہ نیست و نابود ہو جائیں گے۔

ہماری زبان

یکم جون سنہ ۱۹۵۹ء

لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ

لسانی اقلیتوں کے کمشنر شری ملک نے راشٹرپتی کے سامنے جو پہلی رپورٹ پیش کی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے لسانی اقلیتوں کے مسائل کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ جن لوگوں کی مادری زبان ایک اقلیتی زبان کی حیثیت رکھتی ہے، ان کو نہ صرف جذباتی شکایات ہیں، بلکہ ان کو عملی مشکلات اور تکالیف کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لسانی کمشنر نے اپنی رپورٹ میں سفارش کی ہے کہ ریاستی حکومتیں اس معاملہ میں چوکس رہیں، اور تمام شکایات پر ہمدردانہ غور کریں، اور افسروں کو ہدایت کردیں کہ وہ ایسے معاملات میں غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کریں۔ رپورٹ میں لسانی اقلیتوں کی مشکلات اور تکالیف کی تفصیل نہیں دی گئی ہے، لیکن یہ اشارے موجود ہیں کہ تعلیم گاہوں، اور دفتروں کے کام میں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سرکاری ملازمتوں کے حصول میں لسانی اقلیتوں کو امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہاں سوال لسانیاتی تعصب یا جانبداری کا نہیں، حالانکہ اسکی بھی افسوسناک مثالیں موجود ہیں، دراصل لسانیاتی مسئلے کی پیچیدگی اس بات میں پوشیدہ ہے کہ بعض ریاستوں کی سرکاری زبانوں نے بڑی تیزی سے وہ درجہ حاصل کرنے کی کوشش کی جو پہلے انگریزی زبان کو حاصل تھا۔ لازمی طور پر نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جن کی مادری زبان سرکاری زبان سے مختلف تھی تعلیم اور معاش کی دوڑ میں پچھڑنے لگے۔ انصاف کا تقاضہ یہ تھا کہ تعلیم گاہوں، دفتروں اور ملازمتوں میں لسانی اقلیتوں سے فوراً یہ توقع نہ کی جاتی کہ وہ سرکاری زبان پر وہی دسترس رکھیں گی جو دوسروں کو حاصل ہے۔ ان کے ساتھ جس فیاضانہ سلوک کی ضرورت تھی وہ نہیں کیا گیا۔ اب حالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔ بہار کے ریاستی پبلک سروس کمیشن نے کافی دنوں پہلے ہندی کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے خارج کیا تھا، چند ہفتے پہلے اُترپردیش کی حکومت نے بھی یہ ہدایت جاری کی ہے کہ سرکاری ملازمتوں کے امتحانات میں لسانی اقلیتوں سے ہندی کے اس معیار کا مطالبہ نہ کیا جائے جو ہندی والوں سے کیا جاتا ہے۔

لسانی اقلیتوں کو مادری زبان میں تعلیم دینے کے سوال پر رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس معاملے میں کچھ آناکانی کی جاتی ہے۔ کمشنر نے سفارش کی ہے کہ اسکولوں کے لئے یہ لازمی قرار دیا جائے کہ وہ ایسا رجسٹر رکھیں جس میں داخلے کی درخواستوں کا چھ ماہ پیشگی اندراج کیا جائے، ایسی صورت میں اسکول کے منتظمین کو ضروری سہولتیں فراہم کرنے کا وقت ملے گا۔ یہ بہت قیمتی سفارش ہے اور ہر ریاست میں اُردو دوستوں کو اس سے پوری طرح فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

شری ملک نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ ریاستی حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ لسانی اقلیتوں میں یہ اعتماد پیدا کریں کہ تعلیم، روزگار، تجارت اور بیوپار کے معاملات میں ان کے ساتھ لازمی طور پر منصفانہ اور برابر کا برتاؤ ہوگا اور ان کی زبان اور کلچر پر لسانی ریاستیں قائم ہو جانے سے کوئی مخالف اثر نہیں پڑے گا۔ جیسا ہم نے پہلے کہا ہے انصاف اور برابری کا تقاضہ یہ ہے کہ لسانی اقلیتوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرکے انھیں اس بات کا کافی موقع فراہم کیا جائے کہ وہ سرکاری زبانوں پر وہی دسترس حاصل کرلیں جو دوسروں کو ہے، اور خود ان کی مادری زبان ان سے نہ چھینی جائے بلکہ اس کی ترقی کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کئے جائیں۔

گورکھپور یونیورسٹی میں اُردو کا شعبہ

گورکھپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے اپنے ایک اخباری بیان میں وعدہ کیا ہے کہ آئندہ جولائی سے اُردو میں بھی ایم اے کی پڑھائی شروع ہو جائیگی۔ اُترپردیش کے اور خصوصاً مشرقی ضلعوں کے طلبہ اور اُردو دوستوں کو اس خبر سے بڑی مسرت ہوگی۔ جب گورکھپور کی یونیورسٹی قائم ہوئی تھی، اس وقت اُترپردیش کے تعلیمی اداروں میں اُردو کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں ہورہا تھا، اور یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے بھی اُردو کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ لیکن اب حالات کچھ بدلے ہیں، اور وائس چانسلر کے بیان سے یہ توقع ہوتی ہے کہ شاید گورکھپور یونیورسٹی بھی اُردو کی تعلیم و تدریس کا ایک مرکز بنے۔ مگر ایک اچھا شعبہ قائم کرنے کے لئے ابھی سے فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک اچھے کتب خانہ کی فراہمی اور لائق اساتذہ کے تقرر کے علاوہ شعبہ کی صدارت کے لئے ایک معزز اور تجربہ کار اُستاد کی ضرورت ہوگی جس کی موجودگی ہی طلبہ اور اساتذہ میں ادبی کام کا ذوق و شوق پیدا کرے اور وہ ادبی تحقیق میں بھی رہنمائی کرسکے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اُس شہر کی یونیورسٹی جس کے نام کے ساتھ مہدی افادی، پریم چند، فراق اور مجنوں کے نام وابستہ ہیں اُردو کے ایک اچھے اور مضبوط شعبے کی طرف خاص توجہ دے گی۔

بمبئی میں اُردو کی پوزیشن

گذشتہ دنوں انجمن ترقی اُردو، ریاستی شاخ بمبئی کے زیر اہتمام اورنگ آباد میں ایک بہت کامیاب اُردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ شری ہتیندر دیسائی وزیر تعلیم حکومت بمبئی کے خطبۂ افتتاحیہ، جناب مصطفےٰ فقیہہ صاحب کے صدارتی خطبے اور شری من موہن کالیہ، سکریٹری انجمن بمبئی کی جامع رپورٹ کے علاوہ سردار دلیپ سنگھ کے خطبۂ استقبالیہ اور کانفرنس کی تجاویز سے ریاست بمبئی میں اُردو کے مسائل اور اُردو دوستوں کے مطالبات کا ہر پہلو سامنے آجاتا ہے اور سرکاری پالیسی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ابتدائی اور ثانوی جماعتوں میں اُردو کی تعلیم کے لئے حکومت نے جو پالیسی مرتب کی ہے، بمبئی کا اُردو داں حلقہ اس سے بڑی حد تک مطمئن ہے۔ اُردو والوں کے لئے یہ بات بڑی حوصلہ افزا ہے کہ ریاست میں تقریباً ڈیڑھ ہزار ابتدائی اسکولوں میں دو لاکھ بچے اُردو زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اور کوئی ۷۵ ایسے اسکول ہیں جہاں ثانوی تعلیم بھی اُردو زبان میں دی جارہی ہے۔ البتہ اُردو کے ٹرینڈ اساتذہ کی کمی محسوس ہوتی ہے، اور درسی کتابوں کی ترتیب اور تیاری میں اصلاح کی بہت گنجائش ہے۔ اگر حکومت اور دوسرے متعلقہ ادارے مثلاً تعلیمی بورڈ اس بارے میں انجمن کی شاخ سے مدد لیں تو بہت سے مسائل آسانی سے حل ہو جائیں گے۔ اُردو والوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اُردو کے طلبہ فراہم کریں، اور اسکول میں داخلہ، درسی کتابوں کے حصول، اور دوسرے مراحل پر والدین اور طلبہ کی امداد کریں۔ ساتھ ہی ساتھ اسکولوں کی لائبریری اور عام کتب خانوں کے لئے اُردو کے اخبارات کتابیں اور رسالے خریدنے کی مُہم چلائیں، تاکہ اُردو کے طلبہ میں درسی کتابوں کے علاوہ اور بھی چیزیں پڑھنے کا شوق پیدا ہو۔ اس سے ان کے ذوق کی تربیت ہو گی۔

کانفرنس کی ایک قرارداد میں مطالبہ کیا گیا ہے، کہ ریاست بمبئی کے مرہٹہ واڑہ علاقہ میں اُردو کو اسی طرح ثانوی اور سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے جس طرح آندھرا پردیش کے علاقہ تلنگانہ میں دیا گیا ہے۔ یہ بہت جائز مطالبہ ہے اور اس کی حمایت میں ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ بلکہ حق بات تو یہ ہے کہ گجرات، مہاراشٹر اور ودربھ کے علاقوں میں بھی بعض ایسے شہر ہیں، مثلاً احمد آباد، بمبئی، ناگپور، امراؤتی اور اکولہ جہاں اُردو کو اتنی مقبولیت حاصل رہی ہے اور آج بھی ہے کہ یہاں اُردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دی جائے۔ ریاست بمبئی میں اُردو کو اس کا صحیح مقام اسی وقت حاصل ہوگا جب روزمرّہ کے کاروبار میں اس کی ضرورت تسلیم کی جائے۔ عدالتوں میں اُردو کی دستاویزات داخل کرنے، دفتروں میں درخواستیں دینے اور سرکاری اعلانات اور اشتہارات کے اجراء میں جب تک اُردو زبان استعمال نہیں ہونے لگتی اسکی جڑیں مضبوط نہیں ہوں گی۔ اور نگ آباد اُردو کانفرنس کی کارروائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ انجمن کے اراکین اور اُردو دوست حلقے ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر اپنی سرگرمیاں مُرتب کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے۔

ادبی خبریں

پریم چند کا ایک مجسّمہ گورکھپور میں اُس گھر کے سامنے نصب کیا گیا ہے جہاں وہ سنہ ۱۹۱۶ء سے سنہ ۱۹۲۱ء تک مقیم رہے تھے۔ مجسّمہ کی نقاب کُشائی اُن کی بیوی نے کی۔

ڈاکٹر مولوی عبد الحق کو اُردو زبان و ادب کی خدمت کے صلے میں دس ہزار روپے نقد اور صدر کی طرف سے ایک تمغہ دیا گیا۔

ماسکو میں ہندوستانی ادب کے بعض روسی نقادوں کی مُرتب کردہ ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں ہندی شاعر نرالا، پریم چند اور کرشن چندر پر تنقیدی مضامین ہیں اور مسلم یونی ورسٹی کے پروفیسر ہادی حسن کی ایک تصنیف پر تبصرہ بھی شامل ہے۔

حکومتِ ہند نے جاپان میں ہندوستانی سفارت خانے کے ذریعے جاپانی زبان میں ہندی کی گرامر شائع کرانے کے لئے پانچ ہزار روپے کی گرانٹ منظور کی ہے، فرانس کے ایک مشہور ماہرِ علم الہند کی مُرتّب کردہ سنسکرت لغت کی اشاعت کا بھی انتظام کیا جارہا ہے۔

اُتر پردیش کی حکومت نے یکم جنوری سنہ ۶۵۴ء کے بعد شائع ہونے والی ہندی کی طبعزاد تصانیف پر انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہندوستان کی تمام ریاستوں کے مصنفین کتابیں بھیج سکتے ہیں۔

داغ اور امیر مینائی کے مزارات کی تعمیر نو کے لئے ڈاکٹر غلام یزدانی سابق ناظم آثار قدیمہ (حیدر آباد) نے ادب کے شیدائیوں سے مالی امداد کی درخواست کی ہے۔

قطعات

اختر انصاری

جنسِ نایاب

عمر بھر جینے کی تہمت بھی اُٹھے گی یارب!
اور پھر حشر کی زحمت بھی اُٹھے گی یارب!
لیکن اپنا یہ جنوں ہائے یہ جنسِ نایاب
کبھی اس جنس کی قیمت بھی اُٹھے گی یارب!

یہی کیا کم ہے

وجہِ ناز اپنی الم خوردہ ہنسی کیا کم ہے
مایۂ فخر یہ غم دیدہ خوشی کیا کم ہے
تیری بدخوئی و بیہودہ سری کے باوصف
جی لئے اتنے دن اے چرخ یہی کیا کم ہے

تضییعِ جمال

زندگی فرد کی شہ پارۂ فن ہے اُس کا
کون ہے ہم میں جو صانع نہیں، فنکار نہیں
لیکن افسوس یہ ہے، روحِ جمالِ ہستی
پھر بھی شرمندۂ گل کاریٔ اظہار نہیں

وعدۂ حور و قصور

عوضِ مسلکِ طاعت ہمیں منظور نہیں
اُجرتِ کیشِ صداقت ہمیں منظور نہیں
اے خدا! وعدۂ فردوسِ بریں رہنے دے
تیرے قرباں! یہ تجارت ہمیں منظور نہیں

ایک سوال

ضبطِ تحریر میں لائے گئے اچھے افعال
بُرے اعمال بھی لاریب ہوئے درجِ کتاب
مگر اک عمر سے جو بیت رہی ہے مجھ پر
تو نے اُس کا بھی خدایا کہیں رکھا ہے حساب؟

شاہکار

جاوید کمال

شعر کہہ ڈالیں غزل کوئی مکمل کر لیں
جی کو بہلائیں کسی نظم کا عنواں پوچھیں
کوئی مصرعہ لب و رخسار سے ملتا جلتا
کوئی تشبیہ قدِ یار کی چلتی پھرتی
استعارے سے کوئی نور کا پیکر مانگیں،
یا کنایہ میں کسی شوخ کے غمزے رکھدیں
کوئی ترکیب خد و خال کی جانی بوجھی
کوئی صنعت خمِ ابرو کی طرح خم کھینچے
کوئی تخئیل کے پرتو سے تراشیں فرہاد
کسی تلمیح کے پردہ میں زلیخا ڈھونڈیں
قافیوں سے کسی محبوب کا آنچل باندھیں
بحر کے پاؤں میں اوزان کی پائل باندھیں

تجربے ساتھ اگر دیں تو سبھی کچھ لکھ دیں
ذہن کی باہوں میں سمٹے ہوئے خونی منظر
دل کی آغوش میں یادوں کے اُترتے خنجر
فکر و احساس میں ڈوبے ہوئے کتنے نشتر
ایک ہی نظم کی رگ رگ میں سمو دیں شاید
کوئی تسکین کوئی دل کو تسلی مل جائے
شعر کہہ ڈالیں نئی نظم مکمل کر لیں

غزل

طارق اختر انصاری (ناگپور)

جانے کس منزل پہ آیا کاروانِ آرزو
پھر نظر آتا ہے لٹتا سا جہانِ آرزو!
ہائے کیا احساں ترے حُسنِ تغافل نے کئے!
آج ڈھونڈھے سے نہیں ملتا نشانِ آرزو!!
ہمنشیں! کیوں خاک دل سے آج اٹھتا ہے دھواں؟
دیکھنا جلتا نہ ہو اک گلستانِ آرزو!!
جو نہ آپائی لبوں تک، کہہ گئیں نظریں وہ بات
بن گئی آخر خموشی ہی زبانِ آرزو!
دے ذرا فرصت ہمیں بھی اے غمِ دوراں! کبھی،
تو کہے تو ہم بھی کر لیں کچھ بیانِ آرزو!!
اک نظر طارق پہ بھی اے پیکرِ مہر و وفا!
وہ بھی ہے دل میں چھپائے اک جہانِ آرزو!!

معاصرین

ہیرے کا جگر

آج جو دھیرے دھیرے لسانی اقلیتوں کے مسائل حل ہو رہے ہیں اور ملک کی فضا ان کے لئے خوشگوار بنتی جا رہی ہے یہ بھی کرشمہ ہے، ایک چھوٹے سے بیج کا جسے جمہوریت کہتے ہیں۔ اس بیج کے ساتھ جتنا جتنا وقت کا عنصر شامل ہوتا جاتا ہے اقلیتوں کے حقوق تناور درخت بنتے جاتے ہیں۔

جب ہائیکورٹ مسلمانوں کے حق میں حکومت کے خلاف کوئی فیصلہ کرتا ہے تو بعض گمراہ اخبار اس طرح کے تبصرے کرتے ہیں گویا مسلمانوں کو ایک ایسی چیز مل گئی جسے ہندوستان کی مجموعی اسپرٹ کہو، یا اکثریت کہو، یا کانگرس کہو، یا کانگرسی حکومت کہو وہ دینا نہیں چاہتے تھے لیکن طاقتور ہائی کورٹ نے وہ چیز دلادی۔ ان کے نزدیک ہائی کورٹ کسی بیرونی طاقت انگلستان، یا امریکہ، یا روس وغیرہ کی ماتحتی میں کام کرتا ہے۔ اور چونکہ ہندوستان کا اس کے خلاف کوئی بس نہیں چلتا ہے اس لئے وہ مجبوراً بادل ناخواستہ اس کے فیصلوں کو تسلیم کر لیتا ہے۔ اگر یہ اخبار صرف اتنی بات یاد رکھیں کہ موجودہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کو بھی ہندستان کی جمہوریت ہی نے بنایا ہے، اور دونوں چیزوں کا کام آج یا کل ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ برسوں اور صدیوں یوں ہی ہوتا رہے گا تو ان کے سوچنے کا طریقہ بدل جائے۔ یہ عدالتیں جن سے حکومت کسی بات کا جواب نہیں طلب کر سکتی ہے آزادی سے حکومت کی جو بھی بے انصافیاں ہونگی، ان کی پردہ دری کرتی رہے گی اور ان پردہ دریوں اور فیصلوں کا اثر حکومت پر، عوام پر اور ملک کے مزاج پر پڑتا رہے گا۔ اس سے رفتہ رفتہ مساوات اور توازن پیدا ہوگا جو جمہوریت کے خوش گوار پھل ہوتے ہیں اور جسے کوئی دوسرا نظام حکومت نہیں دے سکتا ہے۔

جمہوریت ہی نے لسانی اقلیتوں کے لئے کئی پودے اگائے اور اب وہ پودے پروان چڑھ رہے ہیں لیکن ابھی تناور درخت نہیں بنے ہیں لیکن دس پندرہ، بیس پچیس سال میں بن جائیں گے۔ اس وقت ہندستان کی لسانی اقلیتیں وہ نعمتیں حاصل کر رہی ہوں گی جو بعض ملکوں کو بھی نہ حاصل ہوں گی۔

لسانی کمشنر کی تقرری نتیجہ ہے انجمن ترقی اُردو کی جدوجہد کا، جس کا ہم کئی مرتبہ تذکرہ کر چکے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو میں طاقت پیدا ہوئی ان اکیس لاکھ بالغوں کے دستخطوں کی وجہ سے جو اس نے اُردو کی مہم میں حاصل کئے تھے۔ نہ اس کے یہاں کوئی قانون شکنی تھی، نہ مورچہ بندی تھی، نہ مذہبی نعرے تھے۔ نہ اُردو کے ٹکٹ پر الکشن تھا۔ جو کچھ تھا وہ رائے عامہ کو قائل معقول کر کے ہموار کرنا یعنی جمہوریت سے کام لینا تھا۔ رائے عامہ جوں جوں ہموار ہوتی گئی، حالات بدلتے گئے۔

اُردو کو صرف لسانی کمشنر ہی نہیں ملا ہے بلکہ مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت کے اعلانیے ملے ہیں۔ یا تو بیسک اسکولوں میں صفر تھا، یا ایک لاکھ سے اوپر طالب علم مل گئے ہیں۔ یا ریڈیو سے اُردو دن بہ دن کم ہوتی جا رہی تھی یا خبریں بھی نشر ہونے لگی ہیں۔ ریاستی حکومت نے حامیان اُردو کے مطالبے کے سامنے سر جھکا دیا اور عدالتوں میں اُردو کا استعمال تسلیم کر لیا۔ آخری چیز ہے اُردو کے مرکزی اعلانیہ کا سرکاری زبان کمیٹی کی رپورٹ میں شامل ہو جانا۔ دوسرے لفظوں میں خاموشی سے بلا کسی دھوم دھڑکے کے اُردو کا علاقائی زبان تسلیم کر لیا جانا۔

(قومی آواز۔ ۱۰ مئی سنہ ۱۹۵۹ء)

اُردو، ہندی یا ہندوستانی

کافی عرصہ سے یہ تماشہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ جو فلمیں بنتی ہیں خالص اُردو زبان میں لیکن سنسر سرٹیفکٹ میں "ہندی" لکھا جاتا ہے۔ داغ۔ مرزا غالب ایک شعلے منظور، سیلاب، سنگدل، اور نہ جانے کتنے ہی ایسے نام ہیں جو پکار پکار کر اپنی زبان کا اعلان کر رہے ہیں لیکن اسے تنگ نظری کہا جائے یا مصلحت کہ سنسر سرٹیفکٹ میں "ہندی" ہی درج ہے۔

ہندی زبان کی فلم ہو ہندی لکھا جائے اس میں کسی کو اعتراض نہ ہوگا۔ بلکہ مسرت ہوگی۔ ہندی ایک ہمارے دیش کی زبان ہے۔ اور سرکاری اعزاز کے علاوہ بھی اپنی مدھرتا اور پیار کے سبب ایک مقام رکھتی ہے۔ ہندی کے پریمی ہندی سے جتنا پیار کرتے ہیں اتنا ہی ہمیں ہندی سے اُنس ہے۔ لیکن "تامل" زبان میں اگر کوئی فلم تیار ہو اور سنسر سرٹیفکٹ میں اس کی زبان "ہندی" درج کر دی جائے تو یہ ہندی سے والہانہ محبّت تو نہ ہوگی۔

اسی طرح اُردو میں جب فلم بنے اس کے مکالمے، گانے سبھی اُردو میں ہوں تو اسے ہندی کہنا ہندی کے لئے شوبھا نہیں دیتا۔

ہمیں امید ہے کہ جس طرح فلم ڈویژن نے دستاویزی فلموں اور نیوز ریلوں میں اُردو کو مقام بخشنا شروع کر دیا ہے۔ فلمی دنیا بھی حقائق کو مدنظر رکھ کر اُردو کو اُردو اور ہندی کو ہندی کے لیبل کے ساتھ پیش کرے گی اور اگر اتنی جرأت نہ ہو تو ایسی ہندی اور ایسی اُردو جو عام فہم ہو، "ہندوستانی" کے ٹائٹل کے ساتھ بھی پیش کی جا سکتی ہے۔

"ہندوستانی" جس سے باپو (مہاتما گاندھی جی) کو پیار تھا، اور جو ہندوستان کی زبان "ہندوستانی" چاہتے تھے۔

(فلم سنسار، مئی ۵۹ء)

اپنے دشمن

رفعت زہرہ ۔ میسور

میسور سے یہ مضمون 'ہماری زبان' میں اشاعت کے لئے موصول ہوا ہے۔ مضمون نگار نے خلوص سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جہاں تک انجمن کا تعلق ہے، وہ شمال جنوب دہلی یا لکھنؤ کی حد بندیوں کی قائل نہیں ہے اور اُردو کے ہر لکھنے والے کا اس کی صلاحیت کے مطابق اعتراف ضروری سمجھتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جیسے جیسے ہر گوشے کے ادیبوں اور شاعروں کے کارنامے سامنے آتے جائیں گے، اُردو دنیا صوبجاتی تعصب اور مقامی پاسداری سے بلند ہوتی جائیگی اسی میں اُردو کی فلاح ہے۔ (ادارہ)

چاہیں رشک بُرا نہیں۔ لیکن حسد، جلن، اور "میں ہی شہنشاہ" والی باتیں بُری ہیں۔ بڑوں نے اس بڑے پن کی مذمت کی۔ چھوٹوں نے پڑھا اپنی تقریروں، تحریروں اور ملاقاتوں میں سراہا۔ بچّوں کو نصیحت کی مگر لاشعوری طور پر یہ فعل انھیں سے سرزد ہوگیا۔

انجمن ترقی اُردو علی گڑھ میں کیا خرابیاں ہیں۔ اس طرف میرا دھیان بہت کم گیا۔ شمال سے زیادہ اور جنوب سے کم مجھے یہ احساس دلایا گیا، اور شاید ہماری زبان (میرے دو مضمون شائع ہو چکے تھے) سے ہی میرا پتہ حاصل کر کے مجھے پمفلٹ بھیجے گئے لیکن میں نے اکثر خاموشی اختیار کرلی اور کبھی کبھی جواب خط سے شاد یا ناراض کردیا کہ "اگر دشمن میں بھی خوبیاں تلاش کریں تو وہ دشمن نہ رہے"۔ خلوص سے بُرائی بھی ہوسکتی ہے اور بھلائی بھی۔ خدا، ضمیر اور صالح دماغ کے سہارے جو قدم بھی آگے بڑھیں گے وہ خلوص ثواب بن جائیگا۔ لاعلمی، کم علمی، ذاتی دشمنی یا شخصیت کے بھنور میں خلوص کا حاب ہوگا تو وہ پاپ بن جائیگا۔

غرض علی گڑھ اور انجمن ترقی اُردو نے جو کچھ کام کیا ہے، اس سے انکار نہیں، حالات اور نتائج شاہد ہیں ہندستان جیسے ملک میں اقلیت کی بات علاؤالدین کے چراغ سے نہیں بنجاتی بنتی ضرور ہے، لیکن دیر سے۔ کچھ بزرگ ہستیوں کو بھی غلط فہمی کا شکار ہونا پڑا ہے۔ وہ آج نہیں کل دُور ہو کر رہے گی کیونکہ اُن کی اُنگلی طریقہ کار پر اُٹھی ہے۔ بُرائی پر نہیں۔

بات میں بات نکل آئی تھی۔ مجھے کچھ اور ہی عرض کرنا تھا۔ اپنا ہیں اپنے ہی چراغ سے دامن جلا گئے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے۔ آہیں اور آنسو شاہد ہیں اور غلامی کی داستان لمبی ہے۔ گھر کے بھیدی ہی لنکا ڈھاتے ہیں۔ پونیا، میر جعفر اور میر صادق اپنے محل گراتے ہیں۔ لیکن یزیدیت کربھی ہار جاتا ہے۔ شیر مرجاتا ہے لیکن گھوڑا آدمی کا غلام بن جاتا ہے۔ یہ اپنے دشمنوں کے ادنیٰ کرشمے ہیں۔ اُردو کی ترقی کا محل اگر گریگا بھی تو اینٹوں سے۔ یہی نادان دوست، اپنے دشمن، شمال و جنوب، مشرق اور مغرب میں بُعد پیدا کررہے ہیں۔ یہی مسلمان اور ہندو کی زبان کا سوال پیدا کرتے ہیں۔ شمال اور جنوب کے میل میں رخنہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہاں تو میں عرض کردوں جنوب میں برسوں سے شمال کے خلاف دھیمی نفرت کی آنچ پر "وہ دشمن" کا مواد پک رہا ہے۔ آج نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ کھلم کھلا اجلاسوں میں شکایت کے روپ میں شمال کو دشمن گردانا جارہا ہے۔ کیوں اور کیسے، میں یہاں صرف زبان کے بارے میں عرض کروں گی۔

جنوبی ہند، خاص طور پر مدراس، کیرلا، میسور وغیرہ صوبوں میں تمل، ملیالم اور کنڑی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی دوسری زبان یہاں رائج ہے تو وہ صرف اُردو۔ کیرلا کی اُردو ترقی کے بارے میں صرف اتنا عرض کرونگی کہ وہ سرزمین اُردو زبان کے معاملے میں کچھ زیادہ زرخیز نہیں۔ مدراس میں تو نوابانِ ارکاٹ اور خاص طور پر نواب غلام غوث اعظم مصنف گلزار اعظم جیسے مربیوں سے اُردو جاری ساری رہی، میسور کا علاقہ اپنی نوعیت کا عجیب اور زرخیز علاقہ ہے، سلطنت خداداد سے پہلے بھی یہاں اُردو بولی اور سمجھی جاتی تھی کئی صوفی بزرگوں نے اس کو اپنا مسکن بنایا حضرت خواجہ صدرالدین قادری، حضرت سید محی الدین پاشا قادری جیسے بزرگوں کی زبان فارسی اور عربی کے علاوہ اُردو بھی تھی۔ عوام کو تقریر و تحریر کے ذریعے جو ہدایتیں ملیں وہ اُردو ہی میں تھیں۔ اکثر مخطوطات فراہم ہو چکے ہیں۔ محترمی سروری صاحب نے مراۃ الاسرار (خواجہ صدرالدین) کو شائع فرمایا ہے۔

ٹیپو سلطان نے، جن میں ایک مجاہد، مصنف اور صوفی بزرگ کی ساری صفتیں موجود تھیں، سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لیا تو "غم نہ باشد" کے نام سے جہاں قومی اسمبلی قائم کی اور جمہوریت کی طرف پہلا قدم بڑھایا وہاں اپنی نگرانی میں کتابیں بھی لکھوائیں۔ آپ نے اُردو میں کیا تصنیف فرمایا یہ کہنا دشوار ہے اکثر تصنیفوں میں آپ کا عزم اور روح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ خطوط، فرامین اور خواب کے علاوہ (جو فارسی میں ہیں) دوسری کوئی چیز آپ کے ہاتھ کی نظر نہیں آتی۔ گمان اغلب تو یہ ہے کہ شہادت کے بعد جو لوٹ مار ہوئی اور جو آگ لگائی گئی اس میں اکثر کتابیں بھی ختم ہوئی ہوں گی اس کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی چالیں دیکھتے ہوئے یہ بعید بھی نہیں کہ کچھ کتابوں کو خود ٹھکانے لگا دیا ہو جن لوگوں کے ہاتھوں بچی کھچی کتابیں لگیں وہ خاصی قیمت پر کلکتہ بیچ آئے۔ ٹیپو کے زمانے کے کنڑی لٹریچر کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ جب لائبریری میں تمل ادب کے لئے جگہ نکل سکتی ہے تو کیا ٹیپو مقامی زبان کو کوئی جگہ نہ دے سکے؟ آپ کی مادری زبان فارسی تھی۔ لیکن عوام کے لئے سلطان نے جو ہدایتیں، ترانے اور کتابیں لکھوائیں وہ اُردو زبان میں تھیں۔ خلاصہ سلطانی، فتح المجاہدین، شادی کے گیت وغیرہ مشہور کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ جتنے مصنّف تھے انھوں نے اکثر اُردو ہی میں کتابیں لکھیں۔ ان مصنفوں میں کئی بیجاپور اور شمالی ہند کے بھی تھے۔ یہاں مسلمان ساحلی علاقوں سے ملک کافور کے حملے سے پیشتر بھی آچکے تھے جیسا کہ تاریخ فرشتہ سے پتہ چلتا ہے۔ ٹیپو کی شہرت نے عرب، ایران، ترکی، افریقہ کے باشندوں کے علاوہ اکثر یوروپ کے لوگوں کو بھی ترک وطن کرنے، اور اپنے فن کے مظاہرے و قدردانی کی خاطر میسور آنے پر مجبور

کر دیا تھا۔ جہاں ملک ملک کے لوگ ہوں وہاں اُردو اپنا سکہ جماتی ہے۔ فوجی اخبار کے بارے میں بھی روایتیں ہیں جو اُردو میں نکلا کرتا تھا۔ غرض اگر سلطنت خداداد کی زندگی وفا کرتی تو اُردو کا ایک اور مرکز جنوب میں بن جاتا جس طرح حیدرآباد تھا۔ ٹیپو کی شہادت کے بعد بھی راجاؤں نے اس زبان سے اچھا سلوک کیا کنڑی زبان کے وجود کے باوجود اُردو کا سکہ چلتا رہا تلونگل، گلشن آباد، میسور علم و ادب کے مرکز رہے۔ پھر بنگلور کو یہ حیثیت حاصل رہی کئی اُردو، فارسی اور عربی کے ادیب حیدرآباد چلے گئے۔

اس ساری بحث سے میرا مطلب یہ ہے کہ اُردو کا چلن میسور کیلئے نیا نہیں۔ جن خاندانوں کی زبان عربی و فارسی تھی وہ بھی آج اپنی مادری زبان اُردو ہی کو سمجھتے ہیں۔ غرض اس چلن نے ہمیں کنڑی زبان سے بالکل الگ رکھا۔ (یہ بات حیدرآباد کے علاوہ کسی علاقہ میں نہیں، مورخوں نے حیدرآباد کو دکن کا نام دیا ہے اور کرناٹک ارکاٹ، کیرلا وغیرہ کو جنوبی ہند کا میں نے یہاں اس کا لحاظ رکھا ہے) اُردو داں طبقہ کا قلیل حصہ کنڑی زبان جانتا ہے۔ البتہ بول سب لیتے ہیں۔ اب اگر یہاں کنڑی ذریعہ تعلیم یا علاقائی زبان ہوگئی تو ہمارے لئے ایک بھاری مصیبت ہوگی۔ اپنے کچھ بوڑھے سیاسی لیڈر یا اپنی سنوارگی کے دلدادہ نوجوان لیڈران حقیقتوں سے میسور میں بھی پردہ پوشی کر رہے ہیں۔ حیدرآباد کی طرح یہاں بھی اُردو کی حیثیت تسلیم کرانی ہے اور انجمن ترقی اُردو علی گڑھ جیسی فعال جماعت کی بھی مدد لینی ہے۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ حرف مطلب سے دور ہوگئی لیکن ان حالات کے بغیر میں اپنی اصلی بات کہہ نہیں سکتی تھی۔ میں نے اوپر کہا تھا کہ نادان دوست، اپنے دشمن شمال و جنوب، مشرق و مغرب میں بعد پیدا کر رہے ہیں۔ ان کے میل میں رخنہ ڈال رہے ہیں۔ اردو زبان کی ہی یہ کرشمہ سازی ہے کہ جنوب کے اُردو داں طبقہ میں شمال کا پردیسی اپنے کو جانا پہچانا محسوس کرتا ہے، ان جانا نہیں لیکن زبان کے نا سمجھ دعویداروں نے جنوب کا مختلف طریقوں سے مذاق اُڑایا ہے۔ ایک مشہور عالم بزرگ تشریف لے آئے جلسے کو خطاب کیا۔ فرمایا، مانا کہ آپ اُردو ٹھیک نہیں سمجھتے، پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ سلیس اُردو میں کہوں۔ پاس ادب کے سبب سے عوام نے کچھ نہ کہا مگر بات دل کو چیر گئی۔ اپنی معلومات کا یہ عالم۔ ایک انگریزی اور اُردو اخبار کے نامہ نگار یا نمائندے تشریف لے آئے۔ میسور کے مشہور ادیب و قومی کارکن اور ایک پروفیسر کے ساتھ گھومتے رہے۔ کچھ خریدار بنائے۔ پھر باتوں باتوں میں خلوص سے عرض کیا کہ اُردو کا مسئلہ شمال کا مسئلہ ہے۔ آپ اپنی زبان (کنڑی) کی ترقی میں کوشاں رہیئے۔" جہاں تک میرا خیال ہے صاحب موصوف سے میزبانوں نے انگریزی یا کنڑی میں نہیں بلکہ شستہ اردو میں بات چیت کی تھی۔ پھر بھی میسور کو اُردو سے بیگانہ سمجھتے رہے۔ اس قسم کی ہزاروں مثالیں میرے سامنے ہیں۔ صرف اُردو ہی نہیں۔ ہندی کے ترجمانوں کا بھی یہی حال رہا ہے خدا کا شکر ہے، ڈاکٹر اقبال، مولوی عبدالحق۔ پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر مسعود حسین، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین، غلام السیدین، جیسے حضرات نے نہیں کہا۔ انجمن اشاعت اردو میسور کے سالانہ اجلاسوں کیلئے جو پیغامات ان میں سے اکثر حضرات نے بھیجے تھے (ان میں پروفیسر احتشام حسین کے علاوہ سب کے سب میسور آچکے ہیں) میں نے پڑھے ہیں۔ ان کے الفاظ سے اپنوں کی بو آتی ہے۔ لیکن بڑی تعداد آج بھی جنوب کے بارے میں اچھے خیالات نہیں رکھتی ذرا رسالوں اور اخبار کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں۔ کئی اچھے مضامین لوٹا دیئے جاتے ہیں، میسور کی ایک مشہور افسانہ نگار اور نقاد خاتون، جو اس وقت پاکستان میں رہتی ہیں، کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنا ایک مشہور افسانہ ایک مشہور رسالے کو بھجوایا تو لوٹا دیا گیا لیکن یہی افسانہ جب ان کے مشہور و معروف رسالے میں چھپا تو لوٹانے والے مدیر صاحبان نے جو اچھے افسانہ نگار بھی تھے دل کھول کر تعریف کی۔ انجمن اشاعت اُردو میسور کے ماہانہ اجلاسوں میں پڑھے جانے والے مضامین نظم و نثر (جن میں اکثر تحقیقی، نفسیاتی، علمی، تاریخی اور سائنٹفک تھے۔ جو کافی محنت اور غور و فکر کے بعد لکھے گئے تھے۔ اس کے لکھنے والے بھی ان مضامین کے مانے ہوئے اُستاد تھے معلم تھے) بھیجے گئے تو شمالی ہند کے رسالوں نے ان کو چھاپا نہیں۔ اکثروں نے جواب خط سے ناراض بھی نہیں کیا۔ کچھ مدیر صاحبان نے لکھا۔ ہمارے معیار پر نہیں اُترتے۔ یہ معیار کیا ہے میری سمجھ میں نہیں آیا انھیں رسالوں میں کبھی کبھی انھیں موضوعات پر میں نے کافی سطحی مضامین دیکھے ہیں۔ یا تو کسی کی تصنیف کے نوٹس، یا چربے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دہلی کا ایک رسالہ جو شاید ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے جس کے مدیر اکثر تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ ان کی خدمت میں کنڑی کے مشہور شاعر شری پٹّپا (وائس چانسلر میسور یونیورسٹی) اور مشہور افسانہ نگار شری ماستی وینکٹیش اینگار جن کے دیوان اور افسانوں کو مرکزی حکومت نے انعام کا مستحق سمجھا تھا۔ سلیم تمنائی (جن کے مضامین اور افسانے اُردو میں بھی آج کل، عالمگیر، نظام، زمیندار، قومی زبان اُردو، ترقی، انجمن وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں) شری آر کے، نارائن (انگریزی کے مشہور افسانہ نگار، مسٹر سمپت، بیاچلر آف آرٹس، بلیبنقد ڈاگ کے خالق، جن کی کتابیں امریکہ کے پنگین سیریز وغیرہ میں آچکی ہیں) اور کچھ اسی قسم کے میسور کے مشہور اہل قلم حضرات کی چیزیں ترجمے کی صورت میں بھیجی گئی تھیں لیکن افسوس وہ معیار پر نہیں اُتریں۔ جن سمجھ بوجھ رکھنے والوں نے بھی پڑھا ہے سراہا ہے۔ مواد اور ٹکنیک کے لحاظ سے ان لوگوں کی کہانیاں کافی اہم ہوتی ہیں۔ ان کی کہانیاں پروپیگنڈا نہیں ہوتیں، زندگی بھرپور زندگی کی جاندار مورتیاں ہوتی ہیں۔ ان کی شاعری گرتوں کو اٹھاتی ہی نہیں، لگن اور ہمت کے پر بھی دیتی ہے مسکراہٹ دیتی۔ خیر اسی طرح کا ایک ہفتہ وار پرچہ نکلا جو آئینہ کی طرح خوبصورت تھا۔ کنڑی کے ایک مشہور اہل قلم کے ایک مشہور افسانے کا ترجمہ اس کے ہاں بھجوایا گیا۔ انکار فرمانے والوں میں حرف تہجی کا ایک حرف تھا۔ پس پردہ، پنجاب کا رسالہ جو ترقی کی پگڈنڈی پر گامزن ہے، میری رائے پر میسور کے ایک مشہور افسانہ نگار نے انجمن اشاعت اُردو میں پڑھا گیا ایک افسانہ اس رسالہ کو بھیجا۔ بڑا ہمت افزا خط آیا۔ "افسانہ ملا۔ اچھا ہے ضرور شائع ہوگا۔" پھر درخواست یا خواہش فرمائی گئی۔ "امید ہے آپ اسکی سرپرستی بھی قبول فرمائیں گے" یعنی خریدار بن جائیے۔ یہ مانگ اس افسانہ نگار کے لئے اجنبی ضرور تھی۔ دوسری زبانوں کے کسی اخبار اور رسالے نے ان سے یہ درخواست نہیں کی تھی۔ خیر یہ درخواست قبول کی گئی۔ ایک سال کی مدت ہوگئی اور افسانہ چھپا نہیں۔ خیر، یہ کہانیاں اور مضامین کئی رسالوں میں چھپے اور کافی سراہے گئے۔ ایسی سیکڑوں مثالیں میرے پاس ہیں۔ یہ لوٹا دیئے

کیوں جاتے ہیں۔ اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں۔ ایک جنوب سے اللہ واسطے کا بیر یا احساس برتری (تحلیل نفسی پر شاید یہ کمتری میں تبدیل ہو جائے) یا مدیر حضرات کی لاعلمی۔ کم علمی، قوت فیصلہ و وسعت قلبی کی کمی۔ یا بقول حضرت مجنوں گورکھپوری نام اور ساکھ کے پجاری۔ ہمارے رسائل ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں اکثر ہیں۔ (بٹ رہے ہیں اور بٹتے جائیں گے) جو کسی نہ کسی پارٹی اور اس کے ممبروں کے لئے مختص ہو چکے ہیں۔ اگر ترقی پسند بھائیوں میں یہ برائیاں نمایاں ہو رہی ہیں۔ کاوش بدری مدیر منزل مدراک نے یہ شکایت کی تھی کہ جنوب سے اس پارٹی کا سوتیلی ماں کا سا سلوک ہے۔ اگر میں غلطی پر نہیں اور جو خبریں مجھ تک پہنچی ہیں وہ غلط نہیں تو شمال میں خود ترقی پسندوں کی دوست نواز قسم کی دو پارٹیاں ہیں۔ یہ بہت بُری بات ہے۔ قدیم طبقہ سے یہ شکایت تھی نوجوانوں کو کہ "جائے استاد خالی است" کہہ کر کسی نوجوان کو آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ لیکن جدید طبقہ اس الزام سے بری ہو سکتا ہے؟ ہم میں حالیؔ کتنے ہیں۔ احتشام کتنے ہیں مولوی عبد الحق اور سرور کتنے ہیں۔ جو کسی کی اچھی تخلیق پڑھا ہے مضمون نگار نیا ہی کیوں نہ ہو۔ اُسے بڑھا وا دیں۔ شمال اور جنوب کا بُعد نہ مانیں۔ ہم میں حضرت نیاز، حضرت سرور، اور حضرت شاہد احمد دہلوی جیسے لائق مدیر کتنے ہیں، جو نفسِ مضمون کو دیکھیں، نام اور ساکھ کے پیچھے نہ دوڑیں۔ نگار، ہماری زبان، اردو ادب، اور ساقی اس کے شاہد ہیں انگریزی اور ہندی میں بھی ایسی کئی مثالیں موجود ہیں، لیکن کچھ کم۔ میسور کے ایک مشہور انگریزی زبان کے شاعر اور ادیب ایک انگریزی قلمی نام سے لکھا کرتے تھے۔ برطانیہ اور امریکہ کے علاوہ ہندوستان میں بھی ان کی چیزیں چھپتی تھیں۔ بمبئی کا انگریزی پریس بڑا عجیب و غریب ہی ہے۔ ہمارے مضمون نگار کو یہ سوجھی کہ اصلی نام سے کیوں نہ لکھا جائے یہ بری بات ہے کہ انگریزی نام اختیار کر کے لکھوں۔ نام بدلا مضامین لوٹا دئے گئے۔ ہندوستان میں، اور چھپے تو برطانیہ اور امریکہ میں۔ یہاں نام اور ساکھ کے علاوہ صوبائی اور فرقہ دارانہ تعصب بھی تھا۔ بمبئی کے ایک مشہور نیشنلسٹ اخبار کے مرحوم مدیر (جو خود بڑے نیشنلسٹ.... تھے) نے ان صاحب کا ایک مضمون لوٹا دیا اور جب کلکتہ کے ماڈرن ریویو میں وہی مضمون چھپا تو نقل کرنے میں عار نہ سمجھا۔ ایں چہ بوالعجبی است؟

سعادت حسن منٹو نے کہیں لکھا ہے کہ بمبئی فلم کمپنیوں میں وہ مکالمہ نگار (منشی جی) کی حیثیت سے کام کرتے تھے، کہانی نگار کی حیثیت سے نہیں۔ وہ منشی جی تھے مکالمہ نگار۔ کہانی کے لئے کسی بڑے نام کی ضرورت تھی۔ منٹو نے اپنی ہی کہانی ایک نام اور ساکھ والے بزرگ کے نام منسوب کر دی۔

ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جبکہ اودھ پنچ جیسے اخبار کا کام صرف اقبالؔ کے کلام کی غلطیاں نکال کر مرحوم پر فحش حملے کرنا ہو گیا تھا۔ آج بھی کچھ بزرگ ایسے ہیں جو کسی مانے ہوئے نقاد کے بارے میں کچھ اس قسم کی باتیں کہنا عین ثواب سمجھتے ہیں مثلاً "اردو سے متعلق لکھتے لکھتے وہ اُردو لکھنے لگے ہیں"۔ میں مانتی ہوں کہ زبان اظہار کا ایک اعلیٰ اور اچھا ذریعہ ہے۔ لیکن خیالات مقدم ہیں، سدھار اور حرکت نفس مضمون سے پیدا ہوتی ہے صرف زبان سے نہیں۔ جنوب کے بارے میں یہ دہاد بالتمسخر ہوتا ہے کہ تلفظ، لب لہجہ کے لحاظ سے یہ شمال کے مقابلے میں کوسوں دور ہے۔ شمال میں بھی کوئی بتائے کہ یک رنگی اور یکسانیت کہاں ہے، کیا بقول کسے (شاید حسن عسکری) ہر دس میل پہ لب و لہجہ کی یکسانیت بدل نہیں جاتی۔ اور اس طرح ہمارے شعراء کے اکثر دیوان غلط قرار دے دئے جائیں۔ بقول ڈاکٹر مسعود حسین صاحب کیا لکھنؤ اور دہلی ہی آج بھی مرکز ہیں۔ کیا کسی اور جگہ مرکز نہیں بن سکتا یا بن رہا۔

یہ ساری باتیں ایسی ہیں کہ جس سے نفرت ہی جنم لیتی ہے۔ آج میسور کے پینتیس ۳۵ ہزار، مدراس اور کیرلا کے کئی ہزار لوگوں کی زبان اُردو ہے۔ شمال کی طرح جنوب کی بھی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ برسوں پہلے شمال سے یہاں اُردو بولنے والے آ گئے ہوں۔ لیکن اب وہ جنوب کے ہیں، جب کوئی ان سے یہ کہتا ہے کہ اُردو تمہاری زبان نہیں تو ان کے مقابل سینہ سپر ہو جائینگے۔ لیکن دُکھ تب ہوتا ہے جب کوئی اپنا دُکھ پہنچاتا ہے۔ آج یہ تحریک چل رہی ہے۔ کنڑی۔ تمل، ملیالم۔ تیلگو جاننے والے یہ مشورہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم نے اگر ان زبانوں کو اُردو کے بجائے اپنایا ہوتا تو تمہاری قدر و منزلت اور تمہارے فن کی عزت کہیں زیادہ ہوتی۔ اُردو تو غیروں کی ہے" یہ الفاظ پھاہا بھی ہیں اور زخم بھی۔ لیکن آج آہستہ آہستہ لوگ زخم کو قبول کر رہے ہیں۔ یہ نیک فال نہیں۔ ہمیں اپنے دشمنوں سے بچنا ہے، بچانا ہے۔ ہر مخلص شخص چاہے وہ شمال کا ہو یا جنوب کا ان بُری باتوں کو پسند نہیں کریگا۔ آج جب کہ دنیا سکڑ کر ایک مرکز پر آ رہی ہے۔ یہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں، ہٹ دھرمی اور آمریت کب تک چلے گی۔ اس سے اپنے بھی پرائے ہوتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ علی گڑھ کے سر ایک اور سہرا باندھا جا رہا ہے۔ شمال و جنوب کا بعد ختم ہو رہا ہے۔ علی گڑھ شاید مخدوم کے اس شعر کی عملی تفسیر بنا ہوا ہے :۔ ؎

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو ● چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اس نے جنوب کے کئی ہونہار ادیب و شاعروں کو بھی اپنایا ہے مستقبل میں میری یہ خوشگوار امیدیں ہیں کہ انجمن ترقی اُردو اپنے اس نیک عمل سے اپنے دشمنوں کو بھی عقل کے ناخن دے دے۔ خدا کرے..... دوری ختم ہو..... فاصلہ کم ہو..... ساری دنیا..... خاص کر اُردو دنیا ایک مرکز پر آ جائے۔ حیات بن جائے۔ کائنات اس کے دل میں سما جائے۔ کوئی بیگانہ نظر نہ آئے ؎

اُمید کے سہارے جیتے ہیں ● اُمید کبھی تو پوری ہو گی

چمپین ڈیری فارم

ہماری ڈیری کا ملک شیک پیجئے۔ فرحت حاصل ہوگی
گھر پر سپلائی کا انتظام بھی ہو سکتا ہے
دفتر: شمشاد مارکٹ۔ علی گڑھ

لائبریریوں کے ذریعہ اُردو کی ترقی اور ترویج

(فروغ ادب لائبریری۔ رام پور)

از مسرت حسن آزاد

متعدد محاذوں پر اُردو کا حق اسے دلانے کے لئے جد وجہد ہو رہی ہے اس میں اس بنیادی بات پر زور دینا ضروری ہے کہ ہماری حکومت انجمن ترقی اُردو کی طرف سے پیش کئے گئے مطالبوں کو مان بھی لے تو بھی کوئی خاص فرق نہ پڑے گا جب تک خود ہم سب کے اندر اپنی تہذیب کی اس زندہ یادگار کو قائم رکھنے کی لگن نہ ہو۔

اس کے لئے مکاتب کھولنے اور بچوں کو ابتداءً اُردو میں تعلیم دینے کے بارے میں متعدد بار اکابر اظہار خیال کر چکے ہیں لیکن کیا اس سے زیادہ بہتر صورت یہ نہ ہوگی کہ ہر شہر اور قصبہ میں متعدد چھوٹی بڑی لائبریریوں کا ایک جال بچھا دیا جائے جو اپنے اپنے حلقہ میں کلچر کے مرکز کا کام بھی دیں۔ ان لائبریریوں کا دوگونہ رول ہوگا اُردو زبان کی ابتدائی تعلیم کی ترویج اور نشر و اشاعت اور اردو ادب میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے علم اور ادب کو مزید آگے بڑھانے کے مواقع فراہم کرنا۔ رام پور میں ایسا ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے اور یہاں ایک "خصوصی" لائبریری کے ذخیرے کا خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔

فروغ ادب لائبریری سنہ ۱۹۵۳ء میں رامپور کے چند نوجوانوں کی ادبی دوربینی کی بدولت وجود میں آئی۔ طے یہ ہوا کہ یہ لائبریری اُردو کے رسائل (ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہنامہ، سہ ماہی، سالنامہ) کی خصوصی لائبریری کا کام انجام دے، اس طرح کہ ہند و پاک سے نکلنے والا کوئی بھی رسالہ تلاش کیا جائے تو اس لائبریری میں ضرور ہو۔

اس پروگرام میں اس حد تک کامیابی ہوئی ہے کہ دو چار اہم پرچوں کو چھوڑ کر اس وقت اُردو کے سارے پرچے یہاں آتے ہیں اور ان کے فائل محفوظ ہیں۔ ابھی تک ۱۹۵۳ - ۱۹۵۹ء کا ذخیرہ ہے لیکن پچھلے چند ماہ سے ایک مہم شروع کی گئی ہے کہ اُردو میں شروع سے اب تک جو رسالے نکلے ہیں ان کے فائل یا جتنے پرچے بھی ممکن ہو سکیں لائبریری کے لئے حاصل کئے جائیں۔

اس لائبریری میں ہفتہ وار ادبی اجتماع ہوتے ہیں جن میں ادبی اور لسانی مسائل پر بحث و مشورہ سے لیکر تنقید و تحقیق کی منزلیں بھی طے ہوتی ہیں۔ لائبریری کی طرف سے "شام کا اسکول" چل رہا ہے جس میں اُردو کی تعلیم کا انتظام ہے لیکن خاطر خواہ مالی مضبوطی نہ ہونے کے سبب ہم ابھی تک اپنے کسی پروگرام کو زیادہ پھیلا نہیں سکے ہیں۔ ایک ہفت روزہ کی تجویز ہے جس کے بعد ہم ترقی اُردو کے کام میں شاید ایک قدم اور آگے بڑھا سکیں گے۔

ذیل میں لائبریری میں آنے والے تمام رسائل کی فہرست پیش ہے اس سے اُردو ادیبوں اور محققوں کو شاید اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ کسی رسالہ کی ضرورت ہوگی تو انھیں معلوم رہے گا کہ یہ کہاں سے مل سکتا ہے۔

(۱) سہ ماہی یا دو ماہی پرچے :-

۱۔ "نقوش" (لاہور) ۲۔ "نیا دور" (کراچی) ۳۔ "شعور" (کراچی) ۴۔ "اُردو ادب" (علی گڑھ) ۵۔ "سوغات" (بنگلور) ۶۔ "صحیفہ" (لاہور)

(۲) ادبی ماہنامے :-

۱۔ "افکار" (کراچی) ۲۔ "شاہراہ" (دہلی) ۳۔ "صبا" (حیدر آباد دکن) ۴۔ "فانوس" (کراچی) ۵۔ "نئی قدریں" (حیدرآباد پاک) ۶۔ "ادب لطیف" (لاہور) ۷۔ "مشرق" (کراچی) ۸۔ "ماہ نو" (کراچی) ۹۔ "تحریک" (دہلی) ۱۰۔ "بیسویں صدی" (دہلی) ۱۱۔ "نگار" (لاہور) ۱۲۔ "آجکل" (دہلی) ۱۳۔ "شاعر" (بمبئی) ۱۴۔ "راہی" (جالندھر) ۱۵۔ "فروغ اُردو" (لکھنؤ) ۱۶۔ "ساقی" (کراچی) ۱۷۔ "سوداگر" (کراچی) ۱۸۔ "جام نو" (کراچی) ۱۹۔ "پگڈنڈی" (امرتسر) ۲۰۔ "اشجاع" (کراچی) ۲۱۔ "عکس نو" (لاہور) ۲۲۔ "انشا" (کراچی) ۲۳۔ "قند" (مردان) ۲۴۔ "دانش" (رام پور) ۲۵۔ "نئے چراغ" (کھنڈوہ)

(۳) مذہبی رسائل :-

۱۔ "چراغ راہ" (کراچی) ۲۔ "الحرم" (میرٹھ) ۳۔ "نظامی" (دہلی) ۴۔ "دین دنیا" (دہلی) ۵۔ "آستانہ" (دہلی) ۶۔ "تذکرہ" (کراچی) ۷۔ "فاران" (کراچی) ۸۔ "تجلی" (دیوبند) ۹۔ "الاسلام" (دہلی) ۱۰۔ "مقام رسالت" (کراچی) ۱۱۔ "تشریح" (حیدرآباد) ۱۲۔ "آہنگ" (دہلی) ۱۳۔ "منادی" (دہلی) ۱۴۔ "آستانہ زکریا" (ملتان) ۱۵۔ "النجات" (رام پور) ۱۶۔ "مومن" (بدایوں) ۱۷۔ "پیام حق" (کراچی)

(۴) بچوں کے رسائل :-

۱۔ "کھلونا" (دہلی) ۲۔ "میرا رسالہ" (کراچی) ۳۔ "بھائی جان" (کراچی) ۴۔ "کلیاں" (لکھنؤ) ۵۔ "کھلونا" (کراچی) ۶۔ "ہمدرد نونہال" (کراچی) ۷۔ "نور" (رام پور) ۸۔ "پھلواری" (دہلی)

(۵) خواتین کے رسائل :-

۱۔ "عفت" (لاہور) ۲۔ "بتول" (لاہور) ۳۔ "شہناز" (کراچی)

(۶) دوسرے رسائل :-

۱۔ "ہمدرد صحت" (دہلی) ۲۔ "رومان" (کراچی) ۳۔ "بانو" (دہلی) ۴۔ "طبی دنیا" (دہلی) ۵۔ "سوویت دیس" (دہلی) ۶۔ "ہم لوگ" (لاہور) ۷۔ "نصرت" (لاہور) ۸۔ "کتابی دنیا" (کراچی)

"قومی زبان" (کراچی) "قومی آواز" (لکھنؤ) "نمکداں" "اہلحدیث"۔ "ہماری زبان" (علی گڑھ) "دعوت" (دہلی) "پیام مشرق" (دہلی)

پتہ دیکھئے!
اگر آپ کے پرچے پر سرخ نشان ہے تو یہ اس امر کی علامت ہے کہ دو اشاعتوں کے بعد آپ کی میعاد خریداری ختم ہو جائے گی۔
مہربانی فرما کر "ہماری زبان" کی سالانہ قیمت مبلغ تین روپیہ منی آرڈر سے بھیجئے تاکہ پرچہ کا سلسلہ جاری رہے۔
منیجر

مراسلات

داؤد اورنگ آبادی

اخبار ہماری زبان مورخہ ۸ رمئی ۵۹ء میں داؤد اورنگ آبادی کے متعلق ایک مضمون رشید الدین صاحب کا شائع ہوا ہے، اس میں کئی غلطیاں ہیں، یعنی مفتی ضیاء الدین کو نظام حیدر آباد کا رشتہ دار بتایا ہے جو صریحاً غلط ہے، دوسرے لالہ لچھمی نراین کا تخلص صاحب اور لچھمی لکھا گیا ہے حالانکہ ان کا تخلص صاحب اور شفیق تھا۔ سب سے اہم یہ کہ داؤد کا دیوان ادارہ ادبیات اُردو کی جانب سے خالدہ صاحبہ نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

کسی شاعر کے حالات قلمبند کرنے کے لئے پورے معلومات کی تلاش کرنا چاہئے، اب دکھنی شعراء کے متعلق جو مواد حیدر آباد سے گذشتہ پندرہ بیس سال میں شائع ہو گیا ہے اسکو نظر انداز کر کے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد اپنے معلومات کی بنا پر بنالی جائے تو صحیح نہیں ہوتا۔

نصیر الدین ہاشمی (حیدر آباد)

راجستھان میں غور ہو رہا ہے!

راجستھان اسمبلی میں جناب برکت اللہ خاں ایم ایل اے نے اُردو کے بارے میں چند سوالات کئے تھے۔ ایک سوال یہ تھا کہ مرکزی وزارت داخلہ کے پریس نوٹ مجریہ جولائی ۱۹۵۸ء کی روشنی میں حکومت راجستھان نے ابتدائی درجوں میں اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے کیا کیا ہے جواب ملا کہ اگر ایک کلاس میں دس یا پورے اسکول میں چالیس بچے ایسے ہوں جو اپنی مادری زبان اُردو بتائیں تو ان کو اُردو میں تعلیم دینے کی ہدایت جاری کی گئی ہے۔ جہاں تک اُردو میں درخواستیں اور دستاویزات قبول کرنے کا سوال ہے، مسئلہ ابھی زیر غور ہے۔ ایک سوال یہ تھا کہ دستور ہند کی دفعات ۲۹-۳۰ کی رو سے چودہ زبانوں کے بولنے والوں کو اپنی زبان کے تحفظ اور اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی اجازت دی گئی ہے، حکومت راجستھان نے اُردو والوں کے لئے اس سلسلے میں کیا کیا ہے، جواب ملا کہ حکومت کی اس معاملے میں کوئی ذمہ داری نہیں۔ خدا خدا کر کے ابتدائی درجوں میں اُردو کے ذریعہ تعلیم دینے کی ہدایت جاری کی گئی گو کہ وہ مشروط ہے لیکن عدالت اور سرکاری دفتروں میں اُردو درخواست قبول کرنے پر بس غور ہو رہا ہے، نہ جانے کب تک غور ہوگا، شاید سرکاری اصطلاح میں غیر معین التوا کا نام غور ہے! جب اُردو والوں کی امداد کرنا حکومت کی ذمہ داری نہ سمجھی جائے تو پھر ظاہر ہے کہ زیادہ وقت غور و فکر میں گزرے گا عمل کی گنجائش کم ہوگی۔

(ایک اُردو دوست۔ جے پور)

آسی علیہ الرحمۃ کا شعر

اس میں کوئی شک نہیں کہ مندرجہ ذیل شعر حضرت آسی ہی کا ہے۔ جیسا کہ محمد بشیر الحق صاحب دسنوی نے "ہماری زبان" مورخہ ۸ رمئی ۱۹۵۹ء میں تحریر فرمایا ہے۔

وہاں پہنچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

اس شعر کے متعلق ایک لطیفہ ہے جو لطف سے خالی نہیں مولوی شعیب صاحب مرحوم حضرت آسی کے مرید تھے۔ اکثر بڑے لطف سے فرماتے تھے کہ "ایک دفعہ یہ شعر میں نے حضرت کو سنایا۔ پوچھا کس کا شعر ہے۔ میں نے عرض کیا حضرت ہی کا ہے۔ فرمایا بھئی یوں پڑھو۔

"وہاں پہنچ کے یہ کہنا صبا سلام کے ساتھ
کہ تیرے نام کی رٹ ہو خدا کے نام کے ساتھ"

اس مختصر سی ترمیم نے شعر کو کس قدر بلند کر دیا۔ صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں کہ سلام در بابِ رسالت میں پہنچایا جا رہا تھا۔

(ملاحظہ ہو صفحہ ۳۹۵ گلہائے پریشاں) (الیاس احمد)

راجستھان میں اُردو

بھیلواڑہ میں بھارت سیوک سماج کے اجلاس سے متعلق مشاہدات پیش کر رہا ہوں جو اُردو زبان و ادب کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کے باب میں ہیں یہ کہ میں بھی اس اجلاس میں استقبالیہ کمیٹی کا ممبر تھا اور ممبر ہونے کے باعث مختلف صوبجات سے آئے ہوئے ڈیلی گیٹوں سے باہمی گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ بآسانی اُردو بول لیتے تھے اور اُن سب کے درمیان عام فہم اُردو ہی تھی۔ جب کوئی سمیلن اور مشاعرہ کا پروگرام ہوا تو اس میں اُردو کے شعراء کو سامعین کی خواہش اور اصرار پر بار بار پڑھوایا گیا جب کہ ہندی کے کوئی ایک سے دوسری بار نہیں پڑھوائے گئے ان امور سے اُردو کی ہر دلعزیزی، دل کشی، مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ سب کچھ راجستھان کے علاقے کی بات ہے جہاں کہ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ یہاں اُردو کی ہر دلعزیزی در خور اعتنا نہیں ہے۔

عبدالشکور غوری (انجمن ترقی اُردو بھیلواڑہ)

عہد اسلامی کا ہندوستان
از سید ریاست علی ندوی
یہ کتاب ہندوستان کے عہد متوسط کا آئینہ دار ہے۔ اُردو کے تاریخی ادب میں یہ کتاب اہم اضافہ ہے۔ قیمت ۶/۵۰ روپے
پتہ: انجمن ترقی اُردو ہند۔ علی گڑھ

ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

ــــــــ وقار خلیل

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد (۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء - ۲۶ر فروری ۱۹۵۸ء) کی یاد میں قائم کئے گئے اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح ۱۱ر مئی ۱۹۵۹ء کو مرکزی وزیر سائنٹفک ریسرچ و کلچرل امور پروفیسر ہمایوں کبیر نے جوبلی ہال (باغ عامہ) حیدرآباد میں کیا۔

ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ذریعہ مولانا آزاد مرحوم کے خیالات و طرز فکر کی اشاعت ہوگی۔ یہ کام صرف اُردو تک محدود نہیں رہے گا بلکہ عربی، فارسی، ہندی اور تلگو زبانوں اور فلسفہ، کلچر اور تاریخ جیسے مضامین پر اعلیٰ اور معیاری تحقیقاتی کام انجام دے گا۔ ملک کے مشہور عالم پدما بھوشن ڈاکٹر غلام یزدانی، جامعہ عثمانیہ کے نئے کار والس چانسلر جناب ڈی، ایس، ریڈی، ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا، ڈاکٹر سکسینہ، ڈاکٹر عبدالمعید خاں، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی اور پروفیسر مجید صدیقی کی رہنمائی میں یہ انسٹی ٹیوٹ اپنے پروگرام مرتب کرے گا۔ اور ڈاکٹر ذاکر حسین گورنر بہار، ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر بی گوپال ریڈی، پروفیسر احمد محی الدین، خواجہ غلام السیّدین، پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی جیسے بلند مرتبہ اصحاب اسکی مجلس مشاورت کے روح رواں ہیں۔

نواب مہدی نواز جنگ نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں کہا کہ ”یہ علمی ادارہ ہندوستان کے ایک ایسے حصّے میں قائم کیا جارہا ہے جو اپنے محل وقوع اور تاریخی پس منظر کے لحاظ سے اس کے قیام اور ترقی کے لئے بہترین سمجھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ سرزمین دکن زمانۂ قدیم سے اپنی رواداری، وسیع النظری اور مذہبی و لسانی میل جول و گنگا جمنی تہذیب و تمدّن کے لحاظ سے سنگ میل کا مقام رکھتی ہے۔“

نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے اپنا خطبۂ استقبالیہ ختم کرنے سے پہلے ادارہ ادبیات اُردو کے بانی اور معتمد، ملک کے ممتاز صاحب طرز ادیب و انشا پرداز ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ سے جو اس انسٹی ٹیوٹ کے بھی معتمد اور طرح انداز ہیں، توقع ظاہر کی کہ ”یہ انسٹی ٹیوٹ ان کی نگرانی میں پروان چڑھے گا۔ اور مولانا آزاد کے نام اور آندھرا پردیش کی شان اور روایات کے مطابق کام کرے گا۔“

نواب صاحب کے خطبہ کے بعد ڈاکٹر زورؔ نے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد، وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو، گورنر بہار ڈاکٹر ذاکر حسین، گورنر مغربی بنگال مس پدمجا نائیڈو اور ڈاکٹر تاراچند وغیرہ کے پیامات سنائے۔ نواب مہدی نواز جنگ نے پروفیسر ہمایوں کبیر کی گل پوشی کی اور تالیوں کی گونج میں پروفیسر ہمایوں کبیر نے افتتاحی تقریر شروع کی۔ آپ نے فرمایا کہ ”ہندوستان کی تمام زبانوں کو ترقی کرنے کے مواقع ملنے چاہئیں اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی عوام کو مشرق وسطیٰ اور مغربی ممالک کی زبانوں کو سیکھنا چاہیئے، تاکہ دوسرے ممالک سے بہتر تعلقات قائم ہوسکیں۔“

تراجم کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے پروفیسر ہمایوں کبیر نے کہا کہ ہمیں ایک ایسا پروگرام مدوّن کرنا ہوگا جس پر عمل پیرا ہوکر ان تمام علوم کا ذخیرہ پندرہ بیس سال کے اندر ہر ہندوستانی زبان میں مجتمع ہوجائے۔“

پروفیسر ہمایوں کبیر نے تاریخ میں تحقیق کی وسعت کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ ”ہندوستان کی کوئی بھی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں لکھی جاسکتی جب تک کہ ملک کے آس پاس اور دور تک کھدائیاں مکمل نہیں ہوجاتیں ان کھدائیوں سے ہندوستان کے دوسرے ملکوں سے ماضی میں جو تعلقات رہے ہیں اُن پر گہری روشنی پڑتی ہے۔ آپ نے کہا کہ اس سلسلے میں عربی، فارسی اور ترکی علوم کے ذرائع کو بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور خاص طور پر یہ تحقیقاتی ادارہ اس قسم کے کام تو نسبتاً بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے۔

پروفیسر کبیر نے حیدرآباد اور مولانا آزاد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ”ہندوستان کے مختلف بڑے شہروں میں اس قسم کے انسٹی ٹیوٹ کے قیام کی تحریک تھی لیکن میری دیرینہ آرزو تھی کہ یہ ادارہ حیدرآباد میں قائم ہو، کیونکہ مولانا آزاد کی خصوصیات حیدرآباد کے تہذیب، تمدّن اور کلچر میں نمایاں ملتی ہیں۔ حیدرآباد جو شمال مشرق اور جنوب مغرب کا سنگم ہے اور جہاں بہت سی تہذیبیں اور زبانیں بھی اکٹھی پرورش پاچکی ہیں اس انسٹی ٹیوٹ کے لئے ہر نوع موزوں و مناسب جگہ ہے۔“

پروفیسر ہمایوں کبیر کی تقریر کے بعد معتمد ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ڈاکٹر زورؔ صاحب نے شکریہ ادا کیا اور پھر ادارہ ادبیات اُردو کی طرف سے ایک دل چسپ محفل شعر و سخن منعقد ہوئی۔ عالیشہ ارشاد صاحبہ نے محفل شعر و سخن کے پروگرام کو عمدگی سے کامیاب بنایا۔ اور دکن کے ان مشہور شاعروں نے اپنا کلام سُنایا۔ حیرتؔ بدایونی، شاہد صدیقی، راگھویندر راؤ جذبؔ، سعادت نظیر، متین سروش، قمر ساحری، ابن احمد تابؔ، سرور ڈنڈا، بانو طاہرہ سعیدہ، خیرات ندیم، منظہر کامل، س، ا، عشرت، عزیزہ اقبال، سراج حیدرآبادی، خاور نوری، عباس عابدی وغیرہ

انجمن کی خبریں

ضلع گلبرگہ میں اُردو کنونشن

محبانِ اُردو تعلقہ الند ضلع گلبرگہ کی جانب سے انجمن ترقی اُردو گلبرگہ ڈویژن کی شاخ کے قیام کے سلسلے میں ۳ر مئی ۵۹ء کو مستقر پر ایک اُردو کنونشن طلب کیا گیا تھا۔ اس کنونشن میں انجمن ترقی اُردو گلبرگہ کے ایک وفد نے جو جناب مبارزالدین رفعت، وہاب عندلیب، مجیب الرحمٰن و شکیب انصاری پر مشتمل تھا۔ شرکت کی۔

یہ کنونشن رفعت صاحب صدر انجمن گلبرگہ کی صدارت میں شروع ہوا۔ رفعت صاحب کی صدارتی تقریر کے بعد مسٹر وہاب عندلیب معتمد انجمن ترقی اُردو گلبرگہ اور مجیب الرحمٰن صاحب رکن عاملہ نے حیدرآباد کرناٹک میں اُردو کے مسائل اور الند شریف میں انجمن کی شاخ کے قیام کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ مقامی مقررین میں سے پنڈت راؤ صاحب، اسمٰعیل صاحب چلبل وکیل اور اسمٰعیل الندی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل نے اُردو کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جس کے بعد شرکاء جلسہ نے متفقہ طور پر انجمن ترقی اُردو گلبرگہ ڈویژن شاخ الند شریف کے لئے ذیل کے عہدہ داروں کا انتخاب کیا۔

صدر :- جناب محمد اسمٰعیل صاحب چلبل وکیل

نائب صدر :- شری پنڈت راؤ

معتمد :- جناب مقبول احمد انصاری

شریک معتمد :- جناب ابراہیم انصاری

خازن :- جناب اسمٰعیل الندی بی اے ایل ایل بی وکیل

منتخب صدر انجمن نے عاملہ کے ارکان کو بھی نامزد کیا۔

کنونشن نے ایک قرارداد کے ذریعہ محکمہ تعلیمات سے مطالبہ کیا ہے۔ کہ وہ نئے تعلیمی سال سے اُردو جماعت ہشتم کھول کر اُردو داں طبقہ کے دیرینہ مطالبہ کو پورا کرے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مستقر الند پر کنڑی و مرہٹی بولنے والے طلبہ کے لئے جماعت دہم تک تعلیم کا انتظام ہے۔ مگر اُردو داں طلبہ کے لئے صرف جماعت ہفتم تک۔ حالانکہ مستقر الند کی پندرہ ہزار آبادی میں سے تقریباً ۸، ۹ ہزار افراد اُردو بولتے ہیں۔ نیز حال میں بلدیہ کے انتخابات کے سلسلے میں رائے دہندگان کی فہرست مرتب کی گئی ہے۔ جملہ (۷۲۷۹) رائے دہندگان میں سے اُردو داں رائے دہندگان کی تعداد (۴۱۶۸) ہے۔

قرارداد کے آخر میں محکمہ تعلیمات سے خواہش کی گئی ہے کہ وہ نئے تعلیمی سال سے اُردو جماعت ہشتم کھول کر لسانی اقلیتوں کے ساتھ انصاف کرے۔

معتمد مقبول احمد انصاری کے شکریہ کے بعد اُردو والوں کا یہ اجتماع پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ (سکریٹری)

شاخ امرتسر

بتاریخ ۲ر مئی سنہ ۱۹۵۹ء انجمن ترقی اُردو (ہند) کی امرتسر شاخ کا جنرل اجلاس دفتر ماہنامہ "پگڈنڈی" میں منعقد ہوا۔ مندرجہ ذیل اصحاب باتفاق آرا مقامی شاخ کے عہدہ دار برائے سنہ ۶۰-۱۹۵۹ء منتخب کئے گئے۔

صدر۔ شری رگھوونش چوپڑہ میونسپل کمشنر۔

نائب صدر۔ شری آر۔ ایل بھنڈاری جرنلسٹ۔

سکریٹری۔ شری امریک آنند اڈیٹر "پگڈنڈی"۔

نائب سکریٹری۔ جناب سوز لائل پوری۔

اراکین مجلس عاملہ۔ جناب راز سنتوکھ سری۔ شری کے سی نانگیہ منیجر چترا ٹاکیز۔ سردار ترلوک سنگھ بجاج۔ شری مدن گوپال بھگت۔ شری بلدیو متر۔

جناب سوز لائل پوری اور جناب راز سنتوکھ سری نے اپنے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ (امریک آنند سکریٹری)

انجمن ترقی اُردو (ہند) کی امرتسر شاخ کا اجلاس ۲۶ر اپریل سنہ ۱۹۵۹ء کو دیا بھاسکر پرائمری اسکول، ڈھاب کھٹیکاں امرتسر میں، زیر صدارت جناب کے ایل مہتہ اڈیٹر پنجاب ٹرانسپورٹ ہوا۔

جنرل سکریٹری نے پچھلے اجلاس کی کارروائی پڑھ کر سنائی جناب لچھمن داس صاحب شائق نے انکشاف کیا کہ کچھ لوگ انجمن کی متوازی شاخ کرنے کی کوشش میں ہیں جنرل سکریٹری اور سکریٹری نے اس سلسلہ میں وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ کچھ لوگ جن میں نمود کی خواہش غالب ہے شروع ہی سے ہماری راہ میں روڑا اٹکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ صاحب صدر نے فرمایا کہ ہمیں ہر قسم کی مخالفت کے باوجود اپنا کام جاری رکھنا ہے۔

جناب شرون کمار ورما نے ایک نظم بعنوان "کرب" پڑھی جو بہت پسند کی گئی۔ شری دھنو شرما، شری شنگھارا سنگھ شبنم اور جناب لچھمن داس صاحب شائق نے غزلیں سنا کر خراج تحسین حاصل کیا۔ ساحل صاحب نے دو قطعات اور ایک غزل سنائی۔ اجلاس میں جالندھر اور ترن تارن سے کچھ حضرات نے بھی شرکت فرمائی۔ جناب شائق صاحب نے ایک ریزولیشن پیش کیا کہ انجمن کی یہ شاخ امرتسر میں اُردو سکول جاری کرنے پر جناب چونی لال عامل کی تحسین کرتی ہے۔ ریزولیوشن اتفاق رائے سے پاس ہوا۔

کشمیر میں تمثیلی مشاعرہ

انجمن ترقی اُردو کشمیر کے زیر اہتمام ایس پی کالج سری نگر میں ایک عظیم الشان تمثیلی مشاعرہ اسٹیج کیا گیا۔

جس کو دیکھنے کے لئے سیکڑوں ادب دوست حضرات اور خواتین نے ٹکٹ خریدے تھے اور تقریباً ڈیڑھ سو معزز مہمانوں کو خصوصی دعوت پر بُلایا گیا تھا۔

پردہ کے پیچھے جنت کی ترنم ریز فضاؤں میں بہادر شاہ ظفر کی محزون و مغموم آواز سُنائی دی۔ ساز کے غم آلود سُروں میں ظفر کا دل دوز گیت ختم ہوا تو دھیمی آواز میں مختلف آوازوں میں بات چیت شروع ہوتی ہے۔ شہنشاہ سے رنج واندوہ کا سبب پوچھا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مغل حکومت کی تین سو سالہ یادگار نشانی اُردو زبان بھارت کے قانون نے مٹادی۔ تسلی آمیز آوازیں بتاتی ہیں کہ بھارت کے ایک سدابہار باغ یعنی دنیا کی جنت میں اُردو باقی ہے۔ بادشاہ اپنے رفقاء سمیت فردوس بریں سے جنت ارضی کی طرف پرواز کرتا ہے۔

پردہ اُٹھتا ہے۔ ظفر کا دربار سجا ہوا ہے جس میں ولی، میر، مومن نظیر، انشاء، غالب، ذوق، حالی، اقبال، مجاز، اختر شیرانی اور بہت سے عہد آفریں شعراء اپنے اپنے لباس میں بیٹھے ہیں اور محفل مشاعرہ منعقد ہوتی ہے۔

مشاعرہ سے پہلے جناب شمیم احمد شمیم صدر انجمن ترقی اُردو (کشمیر) نے ایک تقریر میں بتایا کہ اس ڈرامہ کے پیش کنندہ اور ہدایت کار جناب اکبر جے پوری سکریٹری انجمن کے اچانک بیمار ہوجانے کے باعث ہم اس مشاعرہ کو اس زینت وخوبی کے ساتھ پیش نہ کرسکے جیسی کہ توقع تھی۔

اس کے بعد ایک غیر طرحی مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ جناب شوریدہ کاشمیری نے میر مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔ اس مشاعرہ میں جناب وجیہہ احمد وجیہہ، مظفر، شفیق، محبوب احمد محبوب، محمد حنیف پرواز، منظور احمد منظور، مولانا شمس الدین عتیق، شاہد بڈگامی، ولی کاشمیری، سلطان الحق شہیدی اور ڈاکٹر عزیز احمد قریشی نے اپنا اپنا کلام سُنایا۔

جناب وجیہہ احمد اندرابی اور مظفر شفیق نے سکریٹری انجمن کی علالت کے باعث انجمن کی تمام تر ذمہ داریوں کو حُسن وخوبی سے نبھایا۔

(اکبر جے پوری سکریٹری)

لکھنؤ کی شاخ

لکھنؤ شہر کی انجمن ترقی اُردو کے ایک جلسہ میں طے پایا ہے کہ مجلس عاملہ کی مدت پوری ہوجانے کے بعد فی الحال ایک عارضی کمیٹی بنالی جائے اور باقاعدہ انتخابات اگست میں ہوں۔ اس عارضی کمیٹی کے کنوینر شجاعت علی سندیلوی ہیں، اور اس کے ممبروں میں سید احتشام حسین، جناب حیات اللہ انصاری، جناب اختر علی تلہری اور دوسرے اصحاب شامل ہیں۔ جلسے میں طے پایا کہ انجمن کی ممبر سازی کے ساتھ اسکولی مہم کے پروپیگنڈے کا کام بھی شروع کیا جائے۔

حسرت موہانی کی یادیں

۱۸ مئی کو دہلی پبلک لائبریری میں انجمن ترقی اُردو شاخ دہلی کی طرف سے مولانا حسرت موہانی کی یاد میں ایک جلسہ ہوا۔ پروفیسر آل احمد سرور نے صدارت فرمائی جناب وقار احمد رضوی نے حسرت کی زندگی کے متعلق مقالہ پڑھا۔ مفتی عتیق الرحمن صاحب نے بھی حسرت پر تقریر کی۔ سرور صاحب نے حسرت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اُردو کے حامیوں کو اُن کے فرائض کی طرف متوجہ کیا۔

حسرت کا ایک مصرع طرح کے لئے تجویز ہوا تھا اس پر شعراء نے غزلیں کہیں۔ چند اشعار یہاں پیش کئے جاتے ہیں:-

عمر بھر ہم تو رہے شائق بیداد روش
اعتبار اس کے تغافل نے ہمارا نہ کیا (روش صدیقی)

دل کو خوں، خون کو آنسو، تو پھر آنسو کو شراب — زندگی میں نے ترے واسطے کیا کیا نہ کیا
اب تو کچھ لوگ مجھے دیکھ کے کہتے ہیں سلام
شکر ہے اُس نے خدائی کا ادادا نہ کیا (سلام مچھلی شہری)

یوں تو دیکھا ہے تجھیں دیکھنے والوں نے بہت — حسب توفیق نظر پھر بھی نظارا نہ کیا
دَورِ گردوں سے منور یہ شکایت ہی رہی
کبھی اونچا مری قسمت کا ستارا نہ کیا (منور لکھنوی)

غیر کی بات پہ کچھ شعر فلک کہہ ہی دیئے
چُپ رہوں میری خودی نے یہ گوارا نہ کیا (ہیرالعل فلک)

کی غم عشق نے تلقینِ شکایت پیہم — بے نیازی کا مگر دوست کی شکوا نہ کیا
(کامل نظامی)

درد تو بخش دیا درد کا چارا نہ کیا — التفات اُنکی نگاہوں نے دوبارا نہ کیا
جتنے جلوے تھے میسر نہ تھیں آنکھیں اتنی
دیکھنے والے نے جی بھر کے نظارا نہ کیا (کمال جرن اثر)

داستاں ایک زمانے کی زباں پر آئی — اُس نے بھولے سے مگر ذکر ہمارا نہ کیا
ترک دنیا تو بڑی بات نہ تھی اے ناداں
کیا کیا تو نے جو دنیا سے گزارا نہ کیا (طالب دہلوی)

ایک رباعی ترلوک چند محروم نے اُس زمانہ میں کہی تھی جب مولانا حسرت کو قید ہوئی تھی:-

پھر قید فرنگ کا زمانہ آیا — آزاد کی رہ میں قید خانہ آیا
زنداں میں سُنی جو بیڑیوں کی جھنکار — لب پر ترے عشق کا ترانہ آیا

اُردو دُنیا

لسانی اقلیتوں کا تحفظ

اوٹکمنڈ جنوبی زونل وزارتی کمیٹی نے جنوب کی چار ریاستوں مدراس، آندھرا پردیش، کیرالا اور میسور میں لسانی اقلیتوں کو تحفظات دینے کے بارے میں متفقہ فیصلے کئے۔ وزیر مالیات مدراس مسٹر سبرامنیم نے اخباری نمائندوں سے بیان کیا کہ جو تحفظات دئے گئے ہیں وہ مدراس میں لسانی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے ذریعہ تعلیم اور سرکاری ملازمتوں سے متعلق ہیں۔ ان چاروں ریاستوں میں علاقائی زبانوں کو اہمیت حاصل ہوتی جارہی ہے۔ اس روشنی میں فیصلے کئے گئے ہیں۔ فیصلوں کو زونل کونسل کے اجلاس میں مناسب اقدام کرنے کے لئے پیش کیا جائے گا۔ آج کے اجلاس میں چیف منسٹر کیرالا مسٹر نمبودری پد نے شرکت کی۔ پہلے اجلاس میں کیرالا کی نمائندگی ایک سرکاری عہدہ دار نے کی تھی۔ آندھرا پردیش کی نمائندگی وزیر تعلیم مسٹر پٹابھی رام راؤ، اور وزیر فینانس مسٹر برہمانند ریڈی، مدراس کی نمائندگی وزیر فینانس و تعلیم مسٹر سبرامنیم اور میسور کی نمائندگی مسٹر انا راؤ گنا مکھی نے کی۔ طلبہ کے ذریعہ تعلیم کے بارے میں جو فیصلہ کیا گیا ہے وہ تحتانی اور ثانوی مدارس سے تعلق رکھتا ہے۔ مسٹر سبرامنیم نے کہا کہ جنوبی ہند کی چاروں ریاستوں میں علاقائی زبانیں ریاستی سرکاری زبان کی حیثیت سے اہمیت اختیار کرتی جارہی ہیں۔ ان حالات میں لسانی اقلیتوں کی زبان کا مسئلہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اجلاس میں جو فیصلے کئے گئے ہیں وہ تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے کئے گئے ہیں۔ فیصلے متفقہ طور پر کئے گئے۔

(سیاست ۱۸ مئی)

فن خطاطی کے نمونے

"علی عادل شاہ نے جو خود بہت بڑا موسیقار تھا فن موسیقی پر اپنی کتاب خلیل اللہ حسینی خوش نویس کے ہاتھوں لکھوائی اور جب کتاب مکمل ہوئی تو اُس نے خوشنویس کو اپنے تخت پر بٹھایا اور کہا کہ یہ فن کا بادشاہ ہے۔ امراء اس کے آگے کورنش بجالائیں"

ان الفاظ میں ۴ مئی کو پروفیسر نجیب اشرف ندوی ڈائرکٹر انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے بمبئی پردیش کی اس نمائش خطاطی کا افتتاح کیا جس میں حیدرآباد کے نوے سالہ عظیم فن کار حضرت مرزا احشمت علی قادر رقم کے (۴۳۵) قطعات کے علاوہ صوبے کے مشہور خوش نویسوں کے بیسیوں قطعات پیش کئے گئے۔ کئی پرانے خوشنویسوں کے اعلیٰ فن کی نمائش بھی کی گئی۔

انجمن ترقی اُردو بمبئی پردیش کے نئے انتخابات کے بعد سب سے پہلا عظیم الشان کام ایک نمائش خطاطی کا انعقاد تھا جو ۴ مئی سے ۷ مئی تک نہایت کامیابی سے ہوئی اور جس کی کامیابی کا سہرا صدر انجمن ترقی اُردو بمبئی پردیش جناب سید شہاب الدین صاحب دسنوی پرنسپل صابو صدیق پالی ٹکنیک کے سر رہا۔ تمام اہل فن نے انجمن ترقی اُردو کی اس جمیل سرگرمی کو سراہا اور اصولی طور پر یہ طے کر لیا گیا کہ ہر سال ایسی نمائش منعقد کی جائے۔ نمائش کی ترتیب میں خواجہ عین الدین صاحب کتب خانہ دار صابو صدیق پالی ٹکنیک اور شری مدن موہن کالیہ معتمد انجمن ترقی اُردو بمبئی پردیش کی مساعی قابل تحسین رہیں۔

نمائش میں جن دوسرے خوشنویسوں کے قطعات ہیں ان میں حضرت مرزا احشمت علی قادر رقم کے بعض شاگردوں خصوصاً جناب شیخ حسین کے کام کو بہت پسند کیا گیا۔ دیگر خوش نویسوں میں جناب فیض مجددی عبد المجید پروین رقم، عبد الحق، خواجہ نور الدین آزاد، خواجہ سلام الدین اور جناب حبیب اللہ ذکی صاحب کے قطعات نے داد تحسین حاصل کی۔

پروفیسر ندوی نے اپنے ایران کے مشہور خطاط میر عماد الحسینی کا ایک واقعہ یاد دلایا۔ انھوں نے کہا کہ جب ایران کے بادشاہ نے میر عماد الحسینی سے اپنا شاہنامہ لکھوایا۔ تو عماد نے اپنے انتہائی کمال کا مظاہرہ کیا۔ ایسے عمدہ خط میں شاہنامہ لکھا کہ ایک ایک سطر ہیرے موتی کے معاوضے میں خریدی جاسکتی تھی لیکن بادشاہ نے صرف ستّر (۷۰) سکّے عماد کی خدمت میں بھیجے۔ میر عماد نے جب یہ دیکھا تو شاہنامے کے ستّر (۷۰) شعر کاٹ کر بادشاہ کی خدمت میں بھیج دئیے۔ بادشاہ کو بہت غصہ آیا۔ روپے واپس طلب کئے۔ میر عماد نے ایک ایک سطر کاٹی اور شاگردوں کے حوالے کر دیں۔

اورینٹل کالج بمبئی کے سالانہ امتحانات

شعبہ اُردو (ادیب۔ منشی۔ منشی عالم۔ منشی فاضل۔ آنرز ان اُردو)

۱۰ اگست ۱۹۵۹ء سے اور

شعبہ اسلامیات (متعلم اسلامیات۔ ماہر اسلامیات۔ فاضل اسلامیات) ۱۷ اگست سے

ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے کالج کے جملہ سنٹروں میں بیک وقت شروع ہوں گے۔ فیس بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۵ جون اور معہ لیٹ فیس ۱۵ جولائی ہر پانچ طلبہ کی شرکت پر سنٹر قائم کر دیا جاتا ہے۔

دستور و نصاب منگوانے کا پتہ

پرنسپل۔ اورینٹل کالج۔ بھنڈی بازار۔ بمبئی ۳

شاگردوں نے فوری بادشاہ کے سترّ سکے واپس کر دیئے۔ بادشاہ کو بہت غصہ آیا۔ اُس نے بھرے دربار میں کہا۔ کوئی ہے جو اس گستاخ کا خاتمہ کردے۔ دوسرے ہی دن کسی نے میر عماد حسینی کو قتل کر دیا۔ ایک فن داں کی شہادت نے بڑا تہلکہ مچایا۔ آج تک عماد کا نام زندہ ہے اور قاتل بادشاہ پر لعنت بھیجی جاتی ہے۔ اس کا نام تاریخ میں صرف عماد کے ساتھ رہ گیا۔ یہ عظمت ہے فن کی لیکن اس دور میں فن کار کے لئے بڑی مشکلات آگئی ہیں میں عوام سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس فن کی قدر کریں اور نمائش کو کامیاب بنائیں۔

ابتدا میں جناب سید شہاب الدین صاحب دسنوی صدر انجمن ترقی اردو بمبئی پردیش نے خیر مقدمی تقریر میں کہا کہ اس نمائش میں خط نسخ اور خط نستعلیق کے بہت عمدہ نمونے موجود ہیں۔ ان کے دیکھنے ہی سے یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ نستعلیق کے موجد ملک ایران نے کسی کتاب کے ڈی لکس ایڈیشن کے لئے نستعلیق کو اور عام طباعت کے لئے نسخ کو کیوں اختیار کر لیا۔ آج انتہائی خوبصورت، رنگین، اور باتصویر جرائد ایران سے شائع ہوتے ہیں جو ایران کی تہذیب کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ سب نسخ میں ہوتے ہیں کیونکہ اس کے ٹائپ میں لائنوں اور فوٹو ٹائپ کی میکانی سہولتیں موجود ہیں۔ ایران کے یہ رنگا رنگ جرائد خط نسخ کو بھی بہتر سے بہتر بنا رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ نستعلیق کے حُسن سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ یہ رسم الخط ایک بہت بڑے حسین و جمیل آرٹ کا بدل ہے جو مصوری کی مخالفت کے باعث پیدا ہوا۔ اس کے گُل بوٹے اس کی نوک و پلک اور اس کی زیبائش یقیناً ہر کتاب کے ڈی لکس ایڈیشن کے لئے موزوں ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے پھول کھلے ہوئے ہوں۔

دسنوی صاحب نے کہا" آج ہماری نمائش میں بہت اعلیٰ درجے کے نمونے پیش کیئے گئے ہیں۔ حشمت علی صاحب قادر رقم جنوبی ہند میں عماد ثانی کہے جاتے ہیں۔ ان کے قطعات دیکھنے سے کمال فن کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی بصارت اور ان کے ہاتھوں کی طاقت اس نوے سال کی عمر میں بھی بدستور موجود ہے اور وہ خوب لکھتے ہیں۔ سالار جنگ مرحوم جیسے قدر شناسوں نے ان کی بہت قدر کی لیکن اب وہ اس بڑھاپے میں ملک کے گوشے گوشے میں بسنے والے اہل ذوق کی توجہ کے مستحق ہیں۔ نسخ، نستعلیق، گلزار اور جلی اور خفی ہر خط میں ان کے قطعات موجود ہیں۔ دعائیہ قرانی آیتوں کے قطعات تو ایسے ہیں کہ ہر گھر کی زینت بن سکتے ہیں۔

نمائش میں بمبئی کے سابق وزیر جناب مصطفیٰ فقیہ، علامہ احمد الشبلی۔ پروفیسر وجیہہ الدین، مسٹر شہاب، سالسہ کوٹلوی اور اورنگ آباد کے مشہور اُردو نواز ایڈوکیٹ سردار دلیپ سنگھ شامل تھے۔ (نامہ نگار)

گوشۂ احباب

مخدوم کی نظم رقص

میں نے پہلے کسی وقت آپ کو مخدوم کی نظم رقص بھیجی تھی پھر بھیج رہا ہوں۔

رقص

وہ روپ، رنگ، راگ کا پیام لے کے آگیا
وہ کام دیو کی کمان، جام لے کے آگیا
چاندنی کی نرم نرم، آنچ میں تپی ہوئی
سمندروں کی جھاگ میں بنی ہوئی جوانیاں
ہری ہری، روش پہ ہم قدم بھی ہم کلام بھی
بدن مہک مہک کے چل
کمر لچک لچک کے چل
قدم بہک بہک کے چل
الٰہی یہ بساط رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو

مجھے یہ نظم بہت پسند ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ہر لحاظ سے انوکھا پن ہے۔ مغربی ناچ، ہندوستانی طرز بیان، اور میٹر کا انتخاب، سمندروں کی جھاگ کی طرح سفید اور غالباً اسی طرح ناپائدار جوانیاں، چاندنی کی نرم آنچ، اور ہری ہری روش، ایک پینٹنگ کا پتہ دیتی ہیں۔ سمندروں کی جھاگ سے ذہن وینس کی طرف چلا جاتا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ سمندروں سے پیدا ہوئی تھی یا پھر ہندو دیومالا کا وہ مشہور امرت منتھن کا نقشہ اُبھرتا ہے جس میں کئی امرت نکلے تھے اور حُسن اس میں ایک تھا۔

پھر صدائے تیشہ کی کامرانی کی دعا اور کوہکن کی جیت کی آرزو اُردو کی رومانی دنیا کے مشہور اور مسلسل المیہ کی یاد دلاتے ہیں جس میں قیس و فرہاد، مرزا اور رانجھا، سبھی پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے، کبھی تو یہ کامراں ہوں!

لکھنؤ میں تو ایک ہندی کے شاعر نے اتنا پسند کیا کہ وہ خود کالیداس اور راون کی دو نظمیں سنسکرت میں سنانے لگے اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ راون کی نظم اور مخدوم کی نظم کا میٹر ایک ہی تھا اور تینوں نظموں کا موضوع رقص تھا۔

بمبئی کے ایک دوست نے مجھ سے شکایت کی نظم کے تین مختلف ٹکڑوں میں ربط نہیں ہے۔ بات یوں تو معقول تھی لیکن میری رائے میں اسے اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ پکاسو کی تصویروں میں بھی تو روایتی ربط نہیں ہوتا۔

مجھے تو اس بے ربطی میں بھی ایک حُسن نظر آتا ہے۔

(ڈاکٹر) راج بہادر گوڑ (ایم۔پی)

پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علیگڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا